حوالے کر چکے تھے، مگر پھر کیا افتاد پیش آئی اس کا کچھ ذکر نہیں، مولانا پر کئی کتابیں اور مضامین کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں، لیکن ابھی ان کی ایک اچھی سوانحعمری کی ضرورت باقی ہے، مرتب کو مولانا سے بڑی عقیدت ہے، ان کو بھی اس کمی کا احساس ضرور ہوگا کاش اس کی جانب وہ متوجہ ہوتے،

امجد علی شاہ ۔ مرتبہ جناب سبط محمد نقوی صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۳۰۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت ـ ۱۵ روپے، پتہ، از مصنف اکبر پور، فیض آباد،

اس کتاب میں تاجدار اودھ امجد علی شاہ کی زندگی اور ان کے عہد حکومت کے واقعات آٹھ ابواب میں بیان ہوئے ہیں، پہلے باب میں سلطنت اودھ کی مختصر تاریخ اس کے بعد کے تین ابواب میں امجد علی شاہ کی ولادت، تعلیم و تربیت، ولی عہدی، وزارت عظمیٰ، تخت نشینی، نظم مملکت، تعمیری کوششوں اور علمی و دینی کارناموں کی تفصیل پیش کی گئی ہے، پانچویں باب میں انگریزوں سے ان کے تعلقات کا ذکر ہے، ایک ایک باب شاہ کے سب سے معتمد وزیر امداد حسین امین الدولہ اور سلطان العلما مولانا سید محمد کے حالات کے لیے خاص ہیں، آخری باب میں امجد علی شاہ پر اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، مگر مصنف نے بعض نزاعی اور مختلف فیہ امور کا بھی ذکر کر دیا ہے، انھوں نے امجد علی شاہ کی دینداری کو خاص طور پر بیان کیا ہے مگر ان کی دینداری ان کی اپنی روایات کے مطابق تھی، یہ کتاب پر از معلومات ہے اور اس سے تاریخ اودھ پر کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی، مصنف کو تاریخی تحقیق سے خاص دلچسپی ہے، اس کتاب کو لکھنے میں جو کاوش و محنت کی گئی ہے وہ داد کی مستحق ہے

جلد ۱۲۱ ماہ شوال المکرم ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۷۷ء عدد ۴

مضامین

شذرات

اس ماہ کے آخر میں ڈاکٹر محمد اقبالؒ کی صد سالہ سالگرہ کے جشن کے موقع پر دہلی میں ایک بین الاقوامی سمینار ہونے والا ہے، امید کہ اس اجتماع میں اُن کے گوناگوں خیالات و افکار کو زیر بحث لاکر اُن کو ایک شاعرِ مشرق، دانائے راز اور مفکرِ اعظم کی حیثیت سے سمجھنے اور سمجھانے کی پوری کوشش کی جائے گی،

تقسیم ہند کے پہلے اس ملک میں ڈاکٹر اقبال بہت ہی مقبول رہے، ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے روحِ اقبال اور مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے اقبالِ کامل کے ذریعہ سے اُن کو جس طرح یہاں کے لوگوں کو سمجھایا، اس سے بہتر طریقہ پر خود پاکستان کے لوگ شاید اُن کو نہ سمجھا سکے ہیں، ۱۹۴۷ء کے بعد کچھ دنوں تک اُن کی مقبولیت یہاں اس لئے کم ہوگئی کہ وہ تقسیمِ ہند کے محرکوں میں سمجھے گئے مگر رفتہ رفتہ یہ آزردگی جاتی رہی، یہاں کے لوگوں کے دلوں میں اُن کی شاعرانہ عظمت پہلے ہی کی طرح جمنے لگی، اس ناخوشگواری کو دور کرنے والوں میں ایک بہت ہی نمایاں نام جناب جگن ناتھ آزاد کا ہے جو اقبال جیسے عظیم شاعر کو کسی خاص خطہ کی ملکیت سمجھنے کے لئے تیار نہیں، ان کے خیال میں وہ ہندوستان کے ویسے ہی ہیں جیسے پاکستان کے ہیں، انھوں نے بڑی فراخدلی اور بالغ نظری سے اپنی تحریروں میں اس بات کو بار بار دہرایا کہ اقبال کا اسلامی شاعر ہونا کوئی اُن کا نقص نہیں، دنیا کے ممتاز ترین شعرا میں دانتے، ملٹن، ویاس، والمیکی اور تلسی داس وغیرہ نے ابدی شہرت اس لئے حاصل کی کہ انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع اپنے اپنے مذہب ہی کو بنایا، جناب جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی زندگی اور شاعری کی ایک ادبی نمائش بھی تیار کی، اس کو مختلف شہروں میں کچھ ایسی خوش سلیقگی سے دکھایا کہ اقبال کو ہندوستان

واپس آنے میں بڑی مدد ملی،

استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اقبال کی وفات پر لکھا تھا کہ اُن کے ذہن کا ہر ترانہ بانگ درا، اُن کی جانِ حزیں کی ہر آواز زبورِ عجم، اُن کے دل کی ہر فریاد پیامِ مشرق، اُن کا ہر شعر پر پرواز بالِ جبریل تھا، اُن کی فانی عمر گو ختم ہوگئی لیکن اُن کی زندگی کا یہ کارنامہ جاوید بن کر رہے گا، یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہو رہی ہے،

اقبال پر اب تک جتنا لکھا جا چکا ہے، اتنا ہی اور لکھا جائے گا، تو بھی کمی کا احساس ہوگا، اقبال کے کچھ نقاد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ بعض فرنگی فلسفیوں سے متاثر ہوئے، مگر خود اقبال کے اس بیان کو تجزیہ کی ضرورت ہے، کہ اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے، جو قرآن کا ہے، (اقبال نامہ ص ۱۳۰) اُن کو سمجھنے میں اس کو بھی ملحوظ رکھنا ہے، وہ نٹشے کے دماغ کو کافر کہتے ہیں، کو چراغ لے کر آفتاب کو ڈھونڈنے والا، گرمئ گفتار کو رمزِ عشق سے ناآشنا، برگساں کو بستۂ اوہامِ باطل، ٹالسٹائے کو خود پرست فلسفی، کارل مارکس کو رازدانِ جزو کل ہونے کے باوجود نامحرمِ خویش اور لاک، کو تہی جام تصور کرتے رہے، فرنگی فلسفہ کو مجموعی حیثیت سے محبتِ نا استوار کہتے ہیں، اور اس پر یہ لکھ کر استہزا کیا ہے کہ اس میں جلوہ ہے، لیکن جلوۂ بے کلیم ہے، شعلہ ہے لیکن شعلۂ بے خلیل ہے، خرد ہے لیکن یہ متاعِ عشق کی غارت گر ہے،

پھر اُن کی زندگی اور شاعری کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسرارِ الٰہی کے محرم بن کر وہ کلام مجید پڑھتے تو اس کے اوراق اُن کے آنسوؤں سے تر ہو جاتے، اور اُن کو محسوس ہوتا کہ اس کی حکمت قدیم دلائیر ہول پڑھ نہیں رہے ہیں، بلکہ یہ اُن پر یہ نازل ہو رہی ہے عاشقِ رسول کی حیثیت سے ان کا عقیدہ یہ رہا کہ ع از حدودِ مصطفیٰؐ بیروں مشو، وہ اس کے بھی قائل رہے کہ

ع آبروے ما ز نامِ مصطفیٰؐ است

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عشق و محبت کی استواری اور رازداری سے سرشار رہے، حضرت عمرؓ
کے ایمان میں بھی اُن کو عشق کا سرمایہ ملا، حضرت بلالؓ کی نوائے جگر گداز میں اُن کو نورِ نبوت نظر آیا،
رسمِ سلمان و اویس قرنی بھی اُن کے سامنے رہی، اُن کو ردائے فاطمہ زہراؓ کی عفت کا بھی خیال رہا،

پھر بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ شروع سے آخر تک رمز آشنائے رومؒ رہے،
ان ہی سے رازِ زندگی، اور سرِ مرگ ان پر فاش ہوا، ان ہی سے سرور پاکر مقامِ کبریائی کا سرور
حاصل کیا، ان ہی کے فیض سے اُن کے سبو میں جیحون منتقل ہوا، ان ہی کی آتشِ سوز سے اُن کا
علاج ہوا، اسی کے ساتھ اُن کو اعتراف ہے کہ انھوں نے حضرت فضیلؒ اور حضرت ابوسعیدؒ میں
پاک مردانگی پائی، حضرت جنیدؒ اور بایزید بسطامیؒ کے جمال کو بے نقاب دیکھا، منصورؒ کے عرفان
کی تجلیوں میں عینِ فطرت کی تجلی دیکھی، حضرت سید احمد رفاعیؒ کے ضمیر سے نور کو کسب کرنے کی فکر
کی، خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دلِ بے تاب اور دردِ ناشکیبائی میں کیفیت محسوس کی، خواجہ نظام الدین
اولیاءؒ کے لحد کی زیارت میں دل کی زندگی پائی، حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے ذریعہ اُن کو
شعورِ ولایت اور شعورِ نبوت کا فرق معلوم ہوا، حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ کے مزار کی خاک کو
زیرِ فلک مطلعِ انوار سمجھا، اور ان کو صاحبِ اسرار تصور کرکے ان سے چشمِ بینا کے ساتھ چشمِ بیدار
کے خواہاں ہوئے:

حکمائے اسلام میں نگاہِ غزالیؒ کی عزت ان کی نظر میں تھی، بوعلی سینا کے مقامِ فکر تک پہنچنے
کی کوشش کی، سنائی کے صدق و اخلاص کے جویاں ہوئے، حیرتِ فارابی سے متحیر رہے، نظریۂ
زمانے سے متعلق اُن کے خیال کو ابن رشد سے تقویت پہنچی، ابوالدولہ سمنانیؒ اور جنید بغدادیؒ کے خیالات
اپنے اشعار میں منتقل کئے، جمال الدین افغانی اور سر سید کے افکار کا بھی اثر لیا،

سخن گوئی میں شیخ فریدالدین عطار کی غلامی کی، عراقی کے اشعار سے لذت آشنا ہوئے

حدیثِ بوعلی قلندر پانی پتیؒ میں گلِ رعنا کی دلآویزی دیکھی، اللہ تعالیٰ سے امیر خسروؒ کے سینہ کے
آتشدان کے سوز کے طلبگار ہوئے، اپنے کو کشتۂ اندازِ جامی قرار دیا، عرفی کی غیرت اور تخیل اور
فیضی کی توانائی اور جوش کو اپنایا، وہ صائب، ملک قمی، ابوطالب کلیم، میر رضی دانش، عبدالقادر
بیدل کے اشعار سے متاثر ہوکر تضمینیں بھی لکھتے رہے، غنی کشمیری جیسے فقیر لیکن اقلیمِ معنی کے امیر کی
نواسنجی اُن کے ذہن پر چھائی رہی، غالب کی روح اور میر کا درد اپنے دل میں پایا،

ان حقیقتوں کے پیشِ نظر پھر یہ کیسے یقین کیا جائے کہ اقبال فرنگی فلسفیوں کی گاڑی
کے قلی بنے رہے، ان کا فلسفۂ خودی بہت مقبول ہے، اس کو فرنگیت سے ملوث کرنا اپنی بے خبری
کا ثبوت دینا ہے، یہ اسلامی تصوف کی ترقی یافتہ شکل ہے، اقبال خود ہی لکھتے ہیں کہ اسرارِ خودی
کا فلسفہ مسلمان صوفیہ اور حکماء کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے، اور تو اور وقت کے
متعلق برگسان بھی ہمارے صوفیوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں، (اقبال نامہ ص ۴۳) وہ تو یہ
بھی لکھتے ہیں کہ زمان و مکان پر خود ہندوستان کے مسلمان حکماء اور صوفیہ نے بہت کچھ
سوچا، اور لکھا ہے، ان کو یہ افسوس رہا کہ بدقسمتی سے اہلِ مغرب اسلامی فلسفہ کی تعلیم سے
ناآشنا ہیں، ان کی خواہش تھی کہ اسلامی حکماء اور صوفیہ کے نقطۂ نگاہ سے یورپ کو روشناس
کیا جائے، اُن کو یقین تھا کہ اس کا بہت اچھا اثر ہوگا، وہ اس پر کوئی مستقل کتاب تو
نہیں لکھ سکے، لیکن اسلام کے حکماء اور صوفیائے کرام کے یہاں جو چیزیں غیر مرتب تھیں،
ان کو انھوں نے اپنی شاعری میں بہت ہی طاقتور اور ولولہ انگیز طریقہ پر پیش کرکے اپنے
خیالات کی کوثر و تسنیم بہادی:

.....

اقبال کو اس حیثیت سے جاننے کے بعد اُن کا مطالعہ اس لحاظ سے بھی کرنا ضروری ہے کہ

انھوں نے عام انسانیت کو کس طرح سنوارنے کی کوشش کی، خودی، اجتماعی خودی، عقل و عشق، عظمتِ آدم، شرفِ انسانی، انسانِ کامل، حیاتِ اجتماعی، خیر و شر، تسخیرِ فطرت، اور مقصدِ تخلیق وغیرہ سے متعلق اُن کے جو تخیلات اور پیامات ہیں اگر ان پر عمل کیا جائے تو پوری انسانیت سنور سکتی ہے، اسی کے ساتھ ان کی شاعری میں جو تب و تاب ہے، انسانی جذبات کی جو رجائی، زندگی کے قافلے کو طوفان و ہیجان کی منزل کی طرف بڑھانے کا جو جوش و خروش ہے، کائنات کے عظیم کے راز کو فاش کرنے کی جو جستجو ہے، پھول کی پتی سے ہیرے کے جگر کو کاٹنے کی جو تلقین ہے، حسن کی کرشمہ سازیوں کی جو نقاشی ہے، پھر شاعرانہ رمز و کنایہ کا جو حسن ادا ہے، کلام میں غنائی عنصر کی جو فراوانی ہے، بحروں کی جو شگفتگی ہے، ترکیبوں کی جو نزاکت اور تازگی ہے، ان سے ان کی جمالیاتی شاعری کی ابدیت کی لذت برابر ملتی رہے گی،

ہم نے اگر اقبال کو اس صد سالہ جشن کے موقع پر صحیح معنوں میں پالیا تو ہم اپنے کو بھی اس حیثیت سے پالیں گے کہ ہم کو ان سے اسلام کے لئے نیا علم کلام، تصوف کے لئے نئی روح، فلسفہ کیلئے نیا زاویۂ نگاہ، انسانیت کے لئے نئی حرکت، شاعری کے لئے نئی آن بان اور حسنِ ادا کے لئے نیا جادو ملا،

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے عرصہ سے ایک ایسی تنظیم کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو مختلف جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دے، اور جس کا دائرہ کار دین و سیاست، معیشت و معاشرت، تہذیب و تمدن، اور تعلیم و تربیت کے تمام شعبوں کو محیط ہو، وہ ہر طبقہ کے مفاد کو پیش نظر رکھے، مگر طبقاتی کشمکش سے محفوظ اور جماعتی عصبیت سے پاک ہو، خدا کا شکر ہے کہ اکتوبر کے شروع میں مسلم کنونشن کے نام سے دہلی میں یہ اجتماع ہوا، جلسہ توقع سے زیادہ کامیاب رہا، مولانا سید ابو الحسن علی کا خطبۂ افتتاحیہ اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا خطبۂ صدارت دونوں بڑے مؤثر، پُر مغز اور حوصلہ افزا تھے، امید ہے کہ جس اتحاد اور ہم آہنگی کا مظاہرہ کنونشن کے موقع پر کیا گیا ہے، اگر وہ برقرار رہا تو ملت کی پریشانیاں دور ہو جائیں گی،

مقالات

امیر خسروؒ بحیثیت ایک صوفی

از

جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن

ابوالحسن یمین الدین خسروؒ (۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء - ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) کی شخصیت میں بڑی گوناگونی ہے، یہ دنیا کے عظیم ترین شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں، اسی کے ساتھ بلند پایہ نثر نگار بھی تھے، بے مثل ماہر موسیقی بھی، سلاطین دہلی کے محبوب ترین ہم جلیس بھی، وفادار بیٹے بھی، شفیق باپ بھی، اور اپنے مرشد حضرت شیخ المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کے بہت ہی چہیتے اور جان نثار مرید بھی، ان کا جیسا عبقری صدیوں کے بعد ہی کبھی کبھی پیدا ہو جاتا ہے، ان کی عبقریت کے گوناگوں پہلوؤں میں سے اس مقالہ میں وہ جامِ معرفت پی کر جس طرح سرشار اور مخمور رہے، اسی کو ناظرین کے سامنے پیش کرنا ہے۔

سیاسی حیثیت سے تو انھوں نے غیاث الدین بلبن (۶۶۴ھ/۱۲۶۶ء - ۶۸۶ھ/۱۲۸۶ء) سے لیکر محمد بن تغلق کا ابتدائی عہد دیکھا، جب کہ سیاست کی ہر قسم کی ہنگامہ آرائیاں ہوتی رہیں، ہندوستان پر انھوں نے تاتاریوں کے پے در پے خونریز حملے دیکھے، خود ان کے ہاتھوں اسیر ہوئے، اپنے محبوب ترین علمی و ادبی سرپرست شہزادہ محمد سلطان کو میدان جنگ میں ۱۲۸۵ء میں شہید

ہوتے بھی دیکھا، سلطان معز الدین کیقباد (۱۲۸۷ء ۶۸۶ھ - ۱۲۹۰ء ۶۸۹ھ) کی سرمستیاں اور رنگ رلیاں بھی ان کی نظروں سے گذریں، سلطان جلال الدین خلجی (۱۲۹۰ء - ۱۲۹۶ء) کے مصاحب دار کی حیثیت سے اس کے المناک قتل سے بھی متاثر ہوئے، سلطان علاء الدین خلجی (۱۲۹۶ء - ۱۳۱۶ء) کی فتوحات میں بھی شریک رہے، پرواریوں کے ہاتھوں شاہی محل کے اندر سلطان قطب الدین خلجی کا اسفناک قتل بھی ۱۳۲۰ء میں ان کی زندگی میں ہوا، غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰ء - ۱۳۲۵ء) نے ان پرواریوں کو جس طرح مغلوب کیا، اس کے مناظر بھی دیکھے اور آخر میں محمد شاہ تغلق کی حکومت کے آغاز میں اپنی جان اپنے جان آفریں کے سپرد ۱۳۲۶ء ۷۲۵ھ میں کی۔

ان کی پیدائش ۱۲۵۳ء ۶۵۱ھ میں ہوئی، انھوں نے چوہتر ۷۴ برس کی عمر پائی، ان کے پورے دور زندگی میں سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ شیخ المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی روحانی حکومت بھی قائم رہی، ان کے انفاسِ متبرکہ کی وجہ سے بقول مورخ مولانا ضیاء الدین برنی دنیا روشن ہو رہی تھی، ایک عالم نے ان کی بیعت کا ہاتھ پکڑا، ان کی مدد سے گناہگاروں نے توبہ کی، ہزاروں بدکاروں اور بے نمازیوں نے بدکاری سے ہاتھ اٹھالیا، لوگوں کے معاملات میں سچائی پیدا ہوگئی، احکام شریعت وطریقت کے رواج کی رونق بڑھی، خاص و عام، غریب دولتمند، بادشاہ و فقیر، عالم وجاہل توبہ اور پاکی کی تعلیم پانے لگے تھے، بڑے بڑے گناہ لوگوں کے نزدیک کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگے تھے (مزید تفصیلات کے لئے دیکھو تاریخ فیروز شاہی ص ۴۶-۲۴۱)

اسی ماحول میں امیر خسروؒ کی زندگی گذری، شیخ المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا سنہ پیدائش ۶۳۴ھ ہے، اس طرح امیر خسروؒ حضرت خواجہ سے تقریباً سترہ ۱۷ سال چھوٹے تھے، سیر الاولیاء کے مصنف کا بیان ہے کہ جب خسروؒ پیدا ہوئے تو ان کے والد کے گھر کے پاس ایک مجذوب (دیوانہ صاحب نعمت) رہا کرتے تھے، ان ہی کے پاس ان کے والد خسرو کو ایک کپڑے

میں لپیٹ کرلے گئے، مجذوب نے دیکھتے ہی کہا کہ ایک ایسے شخص کو لائے ہو جو خاقانی سے دو قدم آگے ہوگا (سیر الاولیاء، ص ۳۰۱) اس پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ عبد الحق دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ ممکن ہے دو قدم آگے کہنے سے ان مجذوب کا مقصد مثنوی نگاری اور غزل گوئی کے فن میں ہو، کیونکہ قصیدہ گوئی میں بعض بزرگوں کی رائے کے مطابق وہ خاقانی تک پہونچ تو سکے، لیکن آگے نہ بڑھ سکے (ص ۹۳ - ۹۲) مولانا شبلیؒ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجذوب صاحب کے کمالات معنوی کا ہم انکار نہیں کرتے لیکن ان کے شاعرانہ ذوق کا تسلیم کرنا مشکل ہے، خاقانی کو امیر خسرو سے کیا نسبت (شعر العجم جلد دوم ص ۱۰۸)

امیر خسروؒ نے اپنے والد سیف الدین کے متعلق غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ وہ اپنی امارت کے باوجود پاک عفت، فرشتہ خصلت، عبادت گذار اور صاحب ولایت تھے، اسی بات کو اپنے انداز میں اس طرح لکھا ہے:

"عجب سیفے کہ باچندیں صفت گوہر پاکش چناں بودہ کہ ہرگز سخن از زبان او بیرون نیامدے، ترک در خواب فرشتہ باشد او در بیداری فرشتہ بود، از بالا آمدہ آں چناں فرشتہ جز در خواب نتواں دید، صفت ملکی را در طاعت چناں ملکہ کردہ کہ در خورشید سیہ چشم چشم سرخ نکردی ہم از طریق دنیا امیر بود، ہم از جانب عقبیٰ صاحب ولایت باآں کہ امی بود"

غالباً اسی عبارت کو سامنے رکھ کر سیر العارفین کے مصنف نے لکھا ہے کہ امیر سیف الدین لاچین اور پیر مرد صالح اور خدا پرست تھے، خزینۃ الاصفیاء میں بھی ہے کہ

امیر سیف الدین لاچین پیری بے نظیری خدا پرستے بود" (ص ۳۳۹)

سیر العارفین میں ہے کہ حضرت خواجہ سے امیر خسروؒ جب ہمراہ برادران و پدر بزرگوار حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مرید ہوئے تھے، اس وقت ان کی عمر آٹھ برس کی تھی، لیکن اس میں

عمر صحیح نہیں لکھی گئی ہے، کیونکہ امیر خسروؒ نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ وہ اپنے والد کی وفات کے وقت سات سال کے تھے، اس کے بعد وہ اپنے نانا عماد الملک کے یہاں پرورش پانے لگے، ان کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ وہ ان کے نانا نہ تھے بلکہ دوست تھے۔

"آں جد نبود بلکہ دوستے بود، صاحب دولتے چوں چتر سلطان سپاہ دوست عماد الملک بنام"

پھر لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی فراخ دلی سے ہندوستان کی مملکت کو اپنی مٹھی میں کر لیا تھا، اگرچہ وہ عرض کے کام پر مامور تھے، پھر لکھتے ہیں:

"زہے دوات عارض کہ در کار آرائی مملکت ہند ہمہ تن رائے بود، چنانکہ اگر خواستے رائے بگردانیدے وبار کردے"

لکھتے ہیں کہ ایک سو سترہ[۱۱۷] سال کی عمر پائی جس میں ستر سال تک عارض ممالک رہے، اور ایسے عارض کہ ایک لاکھ ہندو، ایک لاکھ سوار ان کے یہاں سے کلاہ اور قبا پاتے تھے، مسلمانوں پر بھی ان کے کرم کی بارش عام تھی، پھر ان کی دعوت اور پان کی تقسیم کا ذکر کرتے ہیں، آخر میں لکھتے ہیں کہ

"آں ہمہ نان دہی مونس تربت او باد"

امیر خسروؒ نے اپنے نانا کا ذکر اپنی عبارت آرائی کے ساتھ مختصر طریقہ پر کیا ہے، لیکن ان کے ہم مشرب اور دوست مولانا ضیاء الدین برنی نے ان کے نانا کی تعریف بہت دل کھول کر کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ وہ سلطان شمس الدین ایلتمش کے عہد میں عرض شکرہ سے عرض ممالک کے عہدے تک پہونچے اور دو قرن تک دیوان عرض کے جملہ معاملات ان ہی کے حکم سے طے پاتے تھے، سلطان بلبن بھی ان کی بڑی عزت کرتا، اس نے حکم دے رکھا تھا کہ خوانین و ملوک کے بعد ان ہی کی نشست رہے، ان کے اختیارات لامحدود تھے، عرض کے وقت جو بھی سوار ان کو منظور نظر

آتا، وہ اس کی تنخواہ پہلے سے زیادہ کر دیتے، اگر لشکر کے کسی سوار کو کوئی حادثہ پیش آجاتا یا وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا تو وہ اس کی مدد کرتے اور کہتے کہ میں لشکر کا سردار ہوں، اگر مصیبت کے وقت لشکری کی فریاد نہ سنوں تو میرا لشکر کا سردار ہونا بے سود ہے، وہ ہر سال دیوان عرض کے ملازمین کو اپنے گھر بلاتے، ان کو خلعت دیتے اور بیس ہزار تنکے ان کو دے کر کہتے کہ وہ آپس میں تقسیم کر لیں، وہ ہر ایک کے ہاتھ کو بوسہ دیتے اور منت کے طور پر کہتے کہ تم بادشاہ پر جو لشکر کا مالک ہے، مجھ پر جو لشکر کا عارض ہوں اور خود لشکر پر جو رعایا کا محافظ ہے رحم کرو اور رشوت کے طور پر لشکر سے کوئی چیز لینے کی توقع نہ رکھو، اس سے لشکر تباہ ہو جائے گا، وہ ان کو مخاطب کر کے یہ بھی کہتے اگر میں لشکر کے کام میں غفلت برتوں گا، رات دن کی فکر میں نہ لگا رہوں گا اور اسکو اپنے بھائیوں اور بیٹوں کی طرح عزیز نہ رکھوں گا تو دنیا میں حرام خور سمجھا جاؤں گا اور آخرت میں کرسی قضا کے سامنے شرمسار ہوں گا۔ دیوان عرض میں ان کی طرف سے کھانا کھلایا جاتا، اس وقت پچاس ساٹھ خوان کھانے کے لائے جاتے جن میں میدے کی روٹی، بکری، حلوان، کبوتر، چوزے کے گوشت، شربت اور پان ہوتے، دستر خوان پر دیوان عرض کے لوگ بیٹھتے، جو کھانا بچ جاتا وہ فقیروں کو دے دیا جاتا، ان کے پان عمدگی کے لئے مشہور تھے، پچاس ساٹھ پان والے غلام پان تقسیم کرنے میں مشغول رہتے، وہ خیرات وصدقات کے لئے بھی مشہور تھے، اور بہت سے گاؤں وقف کئے، ان کی وفات کو کئی قرن گذر گئے ہیں لیکن ان کا وقف کیا ہوا گاؤں باقی ہے، اس کی آمدنی مستحقین پر خرچ ہوتی ہے، ان کی روح کو ثواب پہونچانے کے لئے کھانا دیا جاتا ہے اور ختم قرآن بھی پڑھا جاتا ہے (ص ۱۱۷ - ۱۱۵) عماد الملک کی ان خوبیوں سے متاثر ہو کر سیر العارفین کے مصنف نے لکھا ہے کہ امیر خسروؒ نے اپنے نانا عماد الملک کی تعریف غرۃ الکمال میں لکھی ہے یہ بڑے اولیائے کرام میں سے تھے، امیر خسروؒ نے ان کو ولی تو

نہیں لکھا ہے لیکن ولی کی تمام صفات ان کے ساتھ منسوب کی ہیں اور آخر میں لکھا ہے:

"من یتیم را آں کریم در کنف پرورش می پرورد تا پرور شدم، ہشت سالہ بودم کہ آں بزرگ صد و سیزدہ سالہ شد و در بہشت کہ ہزار سالہ راہ بود بہ یک نفس رسید، زہے قادر قدیمے کہ در دم زدنی ہزار سالہ راہ چشم پیش کردہ۔"

امیر خسروؒ، ضیاء الدین برنی اور سیر الاولیا کے مصنف میں سے کسی نے یہ نہیں لکھا ہے کہ ان کے والد اور نانا حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے تھے، مگر سیر العارفین میں ہے کہ امیر خسروؒ اپنے بھائیوں اور والد کے ساتھ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے مرید ہوئے، والد کے ساتھ خسروؒ کے مرید ہونے کی روایت اس لئے مشکوک ہو جاتی ہے کہ جب ان کے والد کی وفات ہوئی تو وہ سات سال کے تھے، ظاہر ہے کہ حضرت خواجہ اتنے کمسن بچہ کو مرید نہیں کر سکتے تھے، یا شاید برکت کی خاطر مرید کر لیا ہو، مگر یہ تو یقینی ہے کہ امیر خسروؒ کے بھائی اعز الدین علی بھی حضرت خواجہ کے مرید تھے، (فوائد الفواد ص ۹۰ لاہور اڈیشن) میں ہے:

"اعز الدین علی شاہ سلمہ اللہ تعالیٰ کہ یکے از مریدان خاص بود۔"

مرأۃ الاسرار میں واضح بیان یہ ہے کہ صاحب سیر العارفین لکھتے ہیں کہ امیر خسروؒ جس زمانہ میں آٹھ سال کے تھے تو ان کے والد اپنے تین لڑکوں عز الدین علی شاہ، حسام الدین احمد اور ابو الحسن کے ساتھ دہلی آئے، یہ سلطان المشائخؒ کا ابتدائی زمانہ تھا، امیر سیف الدین لاچین اپنے تینوں لڑکوں کے ساتھ آنحضرت کے مرید ہو گئے، (قلمی نسخہ دار المصنفین جلد دوم ص ۴۴۳) اس لئے سیر العارفین کی یہ روایت تو صحیح ہے کہ امیر خسروؒ کے والد اور بھائی حضرت خواجہ سے مرید ہوئے،

سیر الاولیا کی روایت ہے کہ سلطان المشائخ جب بداؤں سے آئے تو سرائے میاں بازار میں اترے، جو سرائے نمک بھی کہلاتی تھی، اپنی والدہ اور ہمشیرہ کو اس جگہ ٹھہرایا اور خود یارگاہ فلاں قواس میں

سکونت پذیر ہوئے جو اس سرائے کے پاس تھی، امیر خسروؒ بھی اسی محلہ میں رہتے تھے، کچھ دنوں کے بعد راوت عرض کا مکان خالی ہوا، کیونکہ ان کے لڑکے اپنے اقطاع پر چلے گئے، راوت عرض امیر خسرو کے نانا تھے، سلطان المشائخ اس گھر میں چلے آئے، دو سال اس مکان میں رہے، یہ برج حصار دہلی متصل مندہ پل کے نزدیک تھا، اس کی عمارت بہت ہی وسیع تھی (ص ۱۰۸)

حضرت خواجہ عماد الملک کے محل میں دو سال تک رہے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ عماد الملک بھی اپنے داماد اور نواسے کے ساتھ حضرت خواجہ کے مرید ہو گئے تھے، ورنہ حضرت خواجہ کا کسی امیر کے محل میں قیام کرنا اپنی درویشی کی شان کے خلاف سمجھتے، عماد الملک کی وفات ۶۷۱ھ میں ہوئی، جب کہ حضرت خواجہ کی عمر اس وقت ۳۷ کی تھی۔ امیر خسروؒ کا بیان ہے کہ عماد الملک کی وفات ایک سو تیرہ سال کی عمر میں ہوئی، اس لحاظ سے دونوں میں عمر کا بڑا تفاوت رہا، گو پیری مریدی میں تفاوت عمر کا چنداں خیال نہیں کیا جاتا ہے، خسروؒ کے والد کا جب انتقال ہوا تو ان کی عمر پچاسی سال کی تھی، حضرت خواجہ سے ان کا مرید ہونا یقینی ہے، مرید ہوتے وقت انھوں نے تفاوتِ عمر کا خیال نہیں کیا۔

سیر الاولیا ہی کی روایت ہے کہ جب خسروؒ کے نانا کے لڑکے اپنے اقطاع سے دہلی واپس آئے تو حضرت خواجہ کو مکان خالی کرنے کو کہا اور ان کو اتنی مہلت بھی نہ دی کہ وہ اپنے لئے کوئی اور رہائش گاہ تلاش کر لیتے، حضرت خواجہ کے پاس کوئی سامان نہ تھا، کچھ کتابیں تھیں، ان کو سر پر رکھ کر ایک مسجد میں آکر مقیم ہوئے، اس کے بعد اپنے معتقدین کے اصرار پر کئی مکانات میں منتقل ہوتے رہے، سیر الاولیا کے مصنف کا بیان ہے کہ جس رات کو حضرت خواجہ نے راوت عرض کا مکان چھوڑا اسی رات کو اس مکان میں آگ لگ گئی اور اس کی تمام رفیع اور بے نظیر عمارتیں زمین پر

گرگر پست ہوگئیں (سیر الاولیا ص ۱۱۱ – ۱۰۹) یہ روایت بہت تکلیف دہ ضرور ہے،

سیر الاولیا کے مصنف کا بیان ہے کہ امیر خسرو اس وقت دہلی میں نہ تھے پٹیالی میں تھے، وہ وہاں ہوتے تو یہ واقعہ پیش نہ آتا، مگر سوال یہ ہے کہ جب حضرت خواجہ یہ مکان چھوڑ رہے تھے تو ان کے اور معتقدین کہاں تھے جو ان کو اپنی کتابیں سر پہ اٹھا کر لیجانی پڑیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ اس زمانہ کے عام تذکرہ نگاروں کا دستور تھا کہ وہ مشائخ کے سلسلہ میں سلاطین، ان کے امراء اور درباریوں کا ذکر کرتے ہیں تو کوئی نہ کوئی بات ایسی لکھ دیتے ہیں جس سے فقر و درویشی کے مقابلہ میں بادشاہت اور امارت فروتر دکھائی دیتی ہے۔

سلطان غیاث الدین بلبن کے لڑکے شہزادہ محمد سلطان کی بیوی کے طلاق و نکاح کے سلسلہ میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے حضرت شیخ صدر الدین ملتانیؒ سے تعلقات میں کشیدگی یا سلطان غیاث الدین تغلق اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے درمیان تناؤ اور ہنوز دہلی دور است کا واقعہ، یا سلطان محمد تغلق اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کی باہمی آویزش اسی قسم کی مثالیں ہیں جو ناقدانہ تجزیہ میں صحیح ثابت نہیں ہوسکتی ہیں (تفصیلات کیلئے دیکھو بزم صوفیہ ص ۱۳۵، ۲۴۸، ۲۸۳)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا جب امیر خسروؒ کے ماموؤں کے گھر سے نکلے تو سیر الاولیا کے مصنف کا بیان ہے کہ دہلی کی سکونت سے ان پر بڑی بددلی طاری رہی، دہلی کے قیام کی بیزاری کا حال فوائد الفواد میں لکھا ہے اور اسی سے سیر الاولیا کے مصنف نے بعض حصے لفظاً بہ لفظاً نقل کئے ہیں، فوائد الفواد میں ہے:

"از دروازۂ کمال بیرون در حظیرۂ کہ برلب خندق است، ہم نزدیک دروازۂ مذکور زمینے بلند است، و دراں حظیرہ شہیدانند، الغرض آں درویش مرا گفت کہ اگر می خواہی کہ ایمان خود بہ سلامت بہ بری، ازیں شہر برو، من ہماں زمان عزیمت کردم کہ ازیں شہر بروم، ولے بموانع ماندہ شد، امروز مدت بست و پنج سال است کہ عزیمت من مقرر است ولے رفتہ نمی شود، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ چوں من ایں سخن ازاں درویش شنیدم، با خود مقرر کردم کہ دریں شہر نباشم چند جائے دل من می شد کہ بروم، لختے دل کردم کہ در قصبۂ پٹیالی بروم، دراں ایام ترک آنجا بودہ است، مقصود ازیں ترک امیر خسرو بود، عصمہ اللہ باز فرمود کہ یک دل کردم کہ در بسنالہ بروم کہ موضعے منزہ است، الغرض در بسنالہ رفتم سہ روز آنجا بودم، دریں سہ روز ہیچ خانہ نیافتم، نہ کرایہ و نہ گروی، نہ بہائے دریں سہ روز ہر روز مہمان یکے بودم، چوں از آنجا باز گشتم ایں اندیشہ در خاطر می بود تا وقتے جانب حوض رانی بودم در باغے کہ آں را باغ جسرت گویند، با خدائے عزوجل مناجات کردم" (ص ۲۴۱-۲۴۲)

سیر الاولیا میں ہے:

از دروازۂ کمال بیروں برلب خندق ہم نزدیک دروازۂ کمال زمینے است بلند و دراں حظیرہ شہیدانند، الغرض آں درویش مرا گفت کہ اگر می خواہی کہ ایمان خود بہ سلامت بہ بری، ازیں شہر بیروں شو، ہماں زماں من عزیمت کردم کہ ازیں شہر بروم، دل بموانع ماندہ شد، مدت بست و پنج سال باشد کہ عزیمت من مقید است و لے رفتہ نمی شود، شیخ المشائخ می فرمود چوں من ایں سخن ازاں درویش شنیدم با خود مقرر کردم کہ دریں شہر نباشم، چند جائے دل من شد کہ بروم، لختے دل کردم کہ در قصبہ پٹیالی بروم، دراں ایام ترک آنجا بود، مقصود ازیں ترک امیر خسرو بود، باز فرمود کہ یک دل کردم کہ در بسنالہ بروم کہ موضع نزدیک است، الغرض در بسنالہ رفتم، سہ روز آنجا بودم، .... ہیچ خانہ نیافتم، نہ گروی نہ کرای، دریں سہ روز ہر روز مہمان یکے بودم، چوں از آنجا

بازگشتم این اندیشہ درخاطر می بود، تا وقتے جانب حوض رانی بودم، در باغے کہ آں را باغ جسرت گویند مناجات کردم ..... (ص ۱۱۱ - ۱۱۰)

فوائد الفواد میں راوت عرض کے محل سے حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے نکلنے اور اس محل کے زمیں دوز ہونے کا ذکر نہیں، امیر خسرو اور ضیاء الدین برنی نے بھی اس ناخوشگوار واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے، اور اگر یہ واقعہ پیش بھی آیا تو حضرت خواجہ اور امیر خسرو کے تعلقات میں کوئی خلل نہیں پڑا۔

اب سوال یہ ہے کہ امیر خسرو حضرت خواجہ سے کب مرید ہوئے؟ سیر الاولیا کے مصنف نے بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ

"وہ یعنی امیر خسرو جب بلوغ کو پہونچے تو وہ سلطان المشائخ کی ارادت کے شرف سے مشرف ہوئے اور طرح طرح کے مخصوص مراحم وشفقت سے مخصوص کئے گئے، ان پر خاص نظر کا لحاظ رکھا جاتا تھا، ان دنوں سلطان المشائخ امیر خسرو کے نانا راوت عرض کے گھر میں رہتے تھے جو منڈہ پل کے دروازہ کے پاس تھا" (ص ۳۰۱)

اس کے بعد سیر الاولیا کے مصنف یہ بھی لکھتے ہیں کہ امیر خسرو عارفانہ طور پر حضرت خواجہ کے محرم راز ہوگئے۔

"باعتقاد صادق در محبت اسرار سلطان المشائخ بودے، کوشید کہ شایان محرمیت اسرار آں حضرت گشت" (ص ۳۰۱)

امیر خسرو اپنی اس ارادت پر زندگی بھر فخر کرتے رہے جس کا اظہار انھوں نے اپنی ان منقبتوں میں کیا ہے جو وہ اپنے دواوین اور مثنویوں میں حمد اور نعت کے بعد بالالتزام لکھتے رہے، مثلاً اپنی مثنوی مطلع الانوار میں اپنے شیخ کی جو منقبت لکھی ہے اس میں پہلے

پیر کی منقبت اس طرح بیان کی ہے:

ہر کہ ز دل دامن پیراں گرفت   گنج بقا زیں دہ ویراں گرفت

ناصیۂ پیر نہ تنہا ست نور   بلکہ جہانے ست ز نور حضور

ناصیۂ پیر نہ تنہا ضیا ست   بلکہ یکے از صفت کبریا ست

چشمۂ خورشید نہ تنہا ضیا ست   بلکہ زمیں را نظرش کیمیا ست

پھر لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے روحانی منعم (آقا) ہی کی نظر کی بدولت سب کچھ حاصل کیا۔

ایں کہ مراہست بخاطر دروں   نقد معانی ز نہایت بروں

نے ز خود این ملک اندیا فتم   از نظر منعم خود یافتم

اسی منقبت میں رقمطراز ہیں کہ ان کو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی غلامی یعنی مریدی پر فخر ہے اور وہ سلسلۂ نظامی میں منسلک ہوگئے ہیں جس کے بعد ان کو کسی آموزگار یعنی مرشد کی ضرورت نہیں:

مفتخر از وے بہ غلامی منم   خواجہ نظام ست و نظامی منم

چو نظر مرحمتش گشت یار   نیست مرا حاجت آموزگار

پھر خداوند تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ حضرت خواجہ کی تعلیم پر عمل کرنے کی سعادت حاصل ہو اور ان کو جو انوار حاصل ہوتے ہیں ان کا کچھ پرتو ان کے یعنی خسرو کے دل پر بھی پڑتا رہے

بار خدایا برضائے خودش   خاص کرم کن بلقائے خودش

تا کہ سعادت بمن آرد پیام   دولت از آں شاہ رسد با غلام

چو ہی از نور مرادش نشاں
پرتو آں بر دلِ خسرو نشاں

اپنی مثنوی شیریں خسرو میں جو منقبت لکھی تو اپنے پیر کو نبی کا بازوئے راز، اسرار قضا کا محرم، میراث نبوی کا کامل نصاب، مقام طہر میں حضرت جعفر طیارؓ کی سیر باللہ فوق ایدیہم کا مظہر وغیرہ سب کچھ کہا ہے، اس مثنوی کے مرتب علی احمد خاں اسیر نے اس منقبت کے متعلق لکھا ہے کہ امیر خسرو کو چونکہ اپنے شیخ کے ساتھ فنا فی الذات کا رتبہ حاصل ہے اسی وجہ سے وہ ایسے موقع پر ہمیشہ بے اختیار و بے خود پائے جاتے ہیں..... ایسی تمام صفات کا ذکر آپ کی محویت تامہ اور فنائیت کاملہ کے براہین قاطعہ ہیں، باین ہمہ جدت اسلوب، ابداع اختراع، استعارات، ایہامات، ایجاد و التزام تشبیہات و صنائع کا دامن کسی وقت ہاتھ سے نہیں چھوٹتا، ہر سادہ اور معمولی مضمون کو فصاحت کا پہلو اختیار کئے ہوئے ایسے پسندیدہ طریق بلاغت سے بیان کرتے ہیں کہ رنگ سخن کی بہار ہزار گونہ بڑھ جاتی ہے (ص ۸۸ - ۸۷، علی گڑھ ایڈیشن)

ارادت کے آداب میں یہ بھی ہے کہ مرید اپنے کو مرشد کا ادنیٰ غلام اور چاکر سمجھے، اسی لئے اپنی مثنوی لیلیٰ مجنوں میں اپنے مرشد کے مختلف فضائل و محاسن بیان کر کے آخر میں لکھتے ہیں:

سند سپہر بر ترش باد   خسرو چو ستارہ چاکرش باد

اپنی مثنوی آئینۂ سکندری میں جب پر زور نعت لکھ لیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) پر در نثار کرتے وقت لولوئے شاہوار حاصل ہوئے تو یہ خیال آیا کہ ان موتیوں کا تحفہ اپنے پیر کی خدمت میں پیش کروں:

نثارے کزاں در انگیختم   بدرگاہ پیغمبرش ریختم

من افشاندم و آسماں برگرفت   عطارد بہ بوسید و بر سر گرفت
مرا گاہ افشاندن آں نثار   بسے دخل شد لولوئے شاہوار
دریغ آیدم کایں چنیں گوہرے   برم تحفہ در خدمت دیگرے
ادب نایدم پیش ازیں در ضمیر   کزاں سازم آرایش مدح پیر
پناہ جہاں دین حق را نظام   رہ قدس را پیشوائے تمام

ہشت بہشت میں جو منقبت لکھی اس میں ارادت کے آداب کے مطابق اپنے کو حضرت خواجہ کا غلام بتاتے ہیں اور حشر میں ان ہی کے ساتھ رہنے کے خواہاں ہوتے ہیں،

ملک وحدت بنام ایشان است   بندہ خسرو غلام ایشان است
نام من زاں ستودہ کیشاں باد   حشر من درمیان ایشاں باد

مثنوی دول رانی میں حمد کے بعد نعت لکھی اور جب نعت لکھ چکے تو کہتے ہیں کہ اب اپنے پیر کا ذکر کرنا ہے:

پس از دیباچہ نعت رسالت   ز ذکر پیر بہ باشد مقالت
نظام الدین حق فرخندہ نامے   کہ دین حق گرفت از وے نظامے

اس مثنوی میں اس آرزو کا بھی اظہار کیا ہے

زہے بخت ار تہ کفشش بمیرم

اپنی مثنوی نہ سپہر میں دل کھول کر لکھا ہے کہ ان کو اپنے شیخ کی ارادت میں ایک عظیم پناہ مل گئی ہے اور وہ راہ مستقیم پر آگئے ہیں اور خوش ہیں کہ ان کو ان کے ضمیر کی بدولت ایک دستگیر مل گیا ہے،

ارادت گہ او پناہے عظیم   الف در ارادت رہے مستقیم

خوش آندم کہ من از اعتقاد ضمیر گرفتم بہ حق دست آں دستگیر

اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ اس شاہ کا ہاتھ میرے لئے ایک کشتی بن گیا ہے جس کے بعد (تصوف کا) بحر میرے لئے کھل گیا ہے' میں نے ان کے منھ سے جو لعاب پایا تو اس کی میرے منھ یعنی میری شاعری میں آب و تاب پیدا ہو گئی' جو زلال میں نے پایا اسی کی تلاش خضر کو ہے' اور اسی کی بدولت (خضر کی طرح) زندہ ہوں، اگر میں اس میں سے دو قطرے دوات میں ڈال دوں تو وہ بحر ظلمات میں آب حیات بن جائیں اور جب میں ان قطروں سے ایک قطرہ اپنے قلم میں منتقل کرتا ہوں تو اس سے ایک دریا بہہ نکلتا ہے' میرے یہ قطرے (اشعار) سمندر کی طرح ہیں لیکن میں ان سے اپنے پیر کی صفات کا احاطہ نہیں کر سکتا ہوں اسی لئے میں اپنے سر کو شرم سے اٹھا نہیں سکتا ہوں جب کہ میں کوشش کرتا ہوں کہ میں نے ان سے جو کچھ پایا ان پر نچھاور کر دوں.

بہ بحر از اں جانم راہ شد چو کشتی مرا دست آں شاہ شد

من از وے لعابِ دہن یافتم کہ زیں گونہ آب دہاں یافتم

زلالم کہ خضر آب جوئے ویست بداں زندہ ام چو ز جوئے ویست

دو قطرہ گزاں در دوات افگنم بہ ظلمت در آب حیات افگنم

چو آں قطرہ از خامہ رانم بروں ازاں قطرہ دریا فشانم بروں

شد ایں قطرہا گرچہ دریا نظیر نگردد محیط صفت ہائے پیر

و لے زیں خجالت نیارم برو کہ ہم زان اولی نثارم برو

ضمیرش کہ دریائے رحمانیست دو خان فلک زو کیے خانی است

پذیرائی ایں قطرۂ خویش باد بریں قطرہ موجش ز در پیش باد

حضرت خواجہ سے امیر خسروؒ کی مریدی کی دھوم ان کے دوستوں اور معاصروں میں بھی رہی' تاریخ فیروز شاہی کے مصنف مولانا ضیاء الدین برنی' امیر خسرو کے پیر بھائی، گہرے دوست اور ہم نشین تھے' وہ لکھتے ہیں کہ

"برسوں امیر خسرو' امیر حسن اور میرے درمیان محبت اور یگانگت کے تعلقات رہے ہیں' وہ نہ میرے بغیر رہ سکتے تھے اور نہ میں ان کی ہم نشینی کے بغیر زندگی بسر کر سکتا تھا:

مولانا ضیاء الدین برنی نے امیر خسرو کی جو تعریف چند سطور میں کی ہے اسی اجمال کی تفصیل لکھ کر بعد کے اربابِ علم اپنا خراج عقیدت پیش کرتے رہے ہیں' مولانا ضیاء الدین لکھتے ہیں کہ

"امیر خسرو جیسا نادر عالم اگر محمود یا سنجر کے عہد میں ہوتا تو ظاہر اور غالب ہے کہ یہ بادشاہ اس کو ولایت اور اقطاع انعام میں دے دیتے"

پھر ان کے شاعرانہ کمالات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"عہد علائی میں شعراء بھی ایسے تھے کہ ان کے بعد بلکہ ان سے پہلے بھی زمانہ کی آنکھ نے ان کی مثل کوئی شاعر نہیں دیکھا تھا' خاص طور پر امیر خسرو جو قدیم اور نئے سب شاعروں کے خسرو یعنی بادشاہ ہیں' جو اختراع معنی، تصنیفات کی کثرت اور رموز غریب کے اظہار میں اپنا نظیر نہیں رکھتے، اگر وہ دوسرے اساتذہ نظم اور نثر کے ایک دو فن میں بیمثال ہوتے تو امیر خسرو جملہ فنون میں ممتاز اور مستثنیٰ حیثیت رکھتے تھے، ایسا صاحب فن کہ جو شاعری کے جملہ فنون میں استاذ اور سرآمد مانا گیا ہو' نہ گذشتہ زمانہ میں گذرا ہے اور نہ بعد کے زمانہ میں قیامت تک کبھی پیدا ہو گا یا نہیں، امیر خسرو نے فارسی نظم

اور نثر میں ایک کتب خانہ تصنیف کیا ہے اور اپنی سخنوری کا سکہ جمایا ہے، شاید خواجہ سنائی نے
یہ شعر امیر خسرو ہی کے متعلق کہا ہے :

بہ خدا او بہ زیر چرخ کبود ٭ ہمچو او ہست و بود و خواہد بود

(ص ۳۵۹)

یہاں تک تو امیر خسرو کے شاعرانہ کمالات پر تبصرہ ہے لیکن میرے اس مقالہ کے لئے ان کی
تحریر کا اہم ٹکڑا یہ ہے :

"اس تمام فضل و کمال اور فصاحت فن و بلاغت کے ساتھ وہ مستقیم الحال صوفی بھی تھے،
ان کی عمر کا بیشتر حصہ صوم و صلوٰۃ اور قرآن خوانی میں گذرا، وہ متعدی اور لازمی عبادات
میں یکتا تھے اور ہمیشہ روزہ رکھتے تھے، وہ شیخ (نظام الدین) کے خاص مریدوں میں
تھے، میں نے اتنا عقیدت مند مرید کوئی اور نہیں دیکھا، عشق و محبت الٰہی سے ان کو پورا
حصہ ملا تھا، صاحب سماع اور صاحب حال و وجد تھے (ص ۳۵۹)

سیر الاولیا کے مصنف بھی امیر خسرو کے پیر بھائی رہے ہیں، وہ بھی رقمطراز ہیں کہ

"امیر خسرو کہ خسرو شاعران سلف و خلف بودہ است و در اختراع معانی و کثرت
تصنعات غریبہ نظیر نداشت و مع ذالک الفضل والکمال والفنون والبلاغ صوفی
مستقیم الحال بود و بیشتر عمر او در صیام و قیام و تعبد و تلاوت گذشتہ است و از مریدان خاص
حضرت سلطان المشائخ شیخ شیوخ العالم سید نظام الحق والدین محمد احمد بداونی البخاری
الچشتی قدس اللہ سرہ العزیز بود و آں چناں مرید و معتقد من دیگرے را ندیدم و از عشق
و محبت نصیبے تمام داشت و صاحب سماع و وجد و صاحب حال بود (ص ۵۰۰)

پھر بعد کے تمام تذکرہ نگاروں نے حضرت خواجہ سے امیر خسرو کی مریدی کا ذکر بڑے

والہانہ انداز میں کیا ہے، پہلے ذکر آچکا ہے کہ سیر العارفین میں ہے کہ امیر خسرو کا پورا خاندان ان سے
مرید تھا، اخبار الاخیار میں ہے :

"از یاران و مریدان قدیم شیخ نظام الدین اولیاست قدس سرہ و غایت اعتقاد و محبت
بہ شیخ داشت و شیخ را نیز بوے نہایت شفقت و عنایت بود، ہیچ کس را بہ خدمت شیخ آں
قرب و محرمیتی کہ امیر خسرو داشت نبود" (ص ۹۲)

مرآۃ الاسرار میں ہے :

"سلطان الشعراء امیر خسرو میر سیف الدین قدس سرہٗ در جمیع کمالات صوری
و معنوی نظیرے نداشت و محبوب ترین مریدان پاک اعتقاد حضرت سلطان المشائخ بودہ
کہ در خلا و ملا بخدمت آں حضرت محرمیت تمام داشت" (ورق ۴۴۳)

سفینۃ الاولیا میں ہے :

"مرید و معشوق و نفس ناطقہ و منظور نظر سلطان المشائخ اند (ص ۱۶۸)

خزینۃ الاصفیا میں ہے :

"حضرت شیخ نظام الدین اولیا را نیز مثل وے (امیر خسرو) محرم اسرار و یار وفادار
و محبوب مطلوب نبود" (ص ۳۳۹)

خسرو کی زندگی کا یہ اعجاز ہے کہ ایک طرف تو اپنے سارے معاصر سلاطین دہلی کے
محبوب، ہمدم، ہمراز اور ہم جلیس بنے رہے، معز الدین کیقباد جیسا رند اور سرمست سلطان بھی ان کا
گرویدہ رہا، جلال الدین خلجی جیسا نیک دل فرماں روا بھی ان کا فریفتہ تھا، علاؤ الدین خلجی
جیسے سخت گیر حکمراں کو بھی ان کے بغیر چین نہیں ملتا تھا قطب الدین مبارک شاہ خلجی جیسا لاپرواہ
اور غیر ذمہ دار سلطان بھی ان کا گرویدہ رہا، غیاث الدین تغلق اور محمد ابن تغلق جیسے بیدار مغز

فرماں رواؤں کے درباروں میں بھی ان کو محبوبیت حاصل رہی، وہ ان سلاطین کے درباروں میں
اس طرح رہے جیسے بھرے ہوئے دودھ کے پیالہ پر گلاب کی پنکھڑیاں رکھی ہوں، ان کے مرشد
حضرت خواجہ نظام الدین اولیأ کسی حال میں بھی اپنے معاصر سلاطین سے ملنا پسند نہ کرتے' ان کے
اس رویہ کی وجہ سے سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کو ان سے پرخاش بھی پیدا ہوگئی تھی،
مگر امیر خسرو نے شاہی دربار سے منسلک رہنے کے باوجود اپنے مرشد کی غلامی، تابعداری اور
اطاعت گذاری میں ایک بے مثال نمونہ پیش کیا' ان کے شاہی آقاؤں میں سے کسی کو ان سے
یہ شکایت نہیں ہوئی کہ وہ اپنے مرشد کے ادنیٰ غلام اور چاکر کیوں ہیں' اور نہ ان کے مرشد کو
یہ گلہ ہوا کہ وہ دربارداری کر کے دنیا سے کیوں ملوث ہوئے، وہ اپنے شاہی آقاؤں اور روحانی
پیشوا کے درمیان بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز دھار کے پل صراط پر پوری زندگی
کامیابی سے چلتے رہے، وہ شاہی محلوں' شاہی درباروں' یا شاہی کیمپوں میں ہوتے تو ان کا
دماغ تو ان جگہوں پر ضرور ہوتا مگر ان کا دل اپنے روحانی مرشد کے خرقہ و کلاہ میں اٹکا رہتا' وہ اپنے
شاہی آقاؤں کو اپنی قصیدہ خوانی' مثنوی نگاری' خوش گلوئی' فن موسیقی' بذلہ سنجی اور حاضر جوابی
سے خوش کرتے مگر اپنے روحانی آقا کے پاس پہونچ جاتے تو کبھی ان کی خدمت میں منقبت کہکر
اپنی عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کرتے، کبھی خلوت میں ان کے ادنیٰ خادم بن کر رہتے' کبھی
ان کے ساتھ مجلس سماع میں رقص کرتے' کبھی خوش الحان قوال بن کر شراب معرفت کے خم کے خم
لنڈھاتے' کبھی سوز عشق کا درس حاصل کرتے، کبھی مجلس میں بیٹھ کر ان کے ملفوظات قلمبند کرتے
رہتے' کبھی ان کی گرانی طبع کو اپنی محبوبانہ اداؤں سے دور کرنے کی کوشش کرتے، سیر الاولیأ کے
مصنف کا بیان ہے کہ سلطان المشائخ جب عشا پڑھ لیتے تو کوٹھے پر جاتے' وہاں کچھ دیر عبادت
کرتے' پھر ان کے سونے کے لئے کھاٹ بچھائی جاتی' اس پر بیٹھ جاتے' ان کے لئے تسبیح آتی،

اس وقت کسی کو آنے کی اجازت نہ ہوتی' صرف امیر خسرو آتے' وہ ان کے سامنے
بیٹھ کر ہر قسم کی باتیں اور حکایتیں سناتے' سلطان المشائخ سن کر ان کی خاطر اپنا
سر مبارک ہلاتے رہتے' وقتاً فوقتاً پوچھتے رہتے کہ ترک کیا کیا خبریں ہیں' اس سے
امیر خسرو کو اور بھی فراخدلی پیدا ہو جاتی' امیر خسرو کچھ پڑھ کر سنانے بھی لگتے،
اس وقت چھوٹے بچے' کچھ رشتہ دار اور مولازادوں کو بھی حاضر ہونے کی اجازت
مل جاتی اور وہ پاؤں دابنے لگتے' اسی موقع کے لئے امیر خسرو نے کہا ہے:

نخفت خسرو مسکیں ازیں ہوس شبہا
کہ دیدہ برکف پایت نہد بخواب شود

(سیر الاولیا ص ۱۲۶ - ۱۲۵)

رات کو اپنے روحانی آقا کے ساتھ خلوت آرا ہوتے لیکن دن کو اپنے شاہی آقا کے یہاں
پہونچ کر انجمن آرائی کرتے' سیر الاولیا کے مصنف نے بجا طور پر لکھا ہے کہ ان کا
مسلک یہ تھا:

ع کمر بخدمت سلطاں بہ بند و صوفی باش

اس مصرع کا پورا شعر یہ ہے:

مراد اہل طریقت لباس ظاہر نیست
کمر بخدمت سلطاں بہ بند و صوفی باش

امیر خسرو کی صوفیانہ زندگی اسی شعر کی تفسیر ہے' وہ سلاطین دہلی کی دربارداری کے لئے
کمربستہ ضرور رہے مگر اسی کے ساتھ شاہراہ طریقت پر بھی بڑی کامیابی کے ساتھ گامزن ہوئے'
سیر الاولیا کے مصنف کا بیان ہے کہ:

"سلطان الشعراء، برہان الفضلا، امیر خسرو شاعر رحمۃ اللہ علیہ کہ گوے سبقت فضل از متقدمان و متاخران بردہ بود و باطنے صاف داشت، طریقۂ اہل تصوف در صورت و سیرت او پیدا بود، گرچہ تعلق بہ بادشاہاں داشت۔"

اسی بات کو اور بھی واضح کر کے شیخ عبدالحق دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے:

"وہ اپنے علم و فضل کے باوجود تصوف کی صفات اور درویشوں کے احوال سے موصوف تھے، اگرچہ بادشاہوں سے تعلقات رکھتے اور ملوک و امراء سے خوش طبعی اور ظرافت سے اختلاط کرتے لیکن ان سب کی طرف ان کا دل متوجہ نہ تھا، یہ بات اس طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان کے کلام میں جو برکات ہیں وہ گنہگاروں کے دل میں نہیں پائی جا سکتی ہیں۔ برکات سے محروم لوگوں کے کلام کو مقبولیت اور قلبی تاثیر حاصل نہیں ہو سکتی۔"

(ص ۹۲)

دربار سے منسلک ہونے کے باوجود امیر خسرو کو اپنے مرشد سے جو قلبی لگاؤ رہا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے ایک بار ان سے فرمایا کہ میں سب سے تنگ آجاتا ہوں لیکن تم سے تنگ نہیں آتا ہوں، دوسری بار اسی بات کو اس طرح فرمایا کہ میں سب سے تنگ آجاتا ہوں حتیٰ کہ اپنے آپ سے تنگ آجاتا ہوں لیکن تم سے تنگ نہیں آتا ہوں۔

(سیر الاولیا ص ۳۰۲)

(باقی)

مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی و ادبی خدمات

از

عشرت افروز ایم۔اے۔ کراچی

(۳)

سید صاحب کے ادبی مضامین پر ایک نظر

معارف میں سید صاحب کے جتنے مضامین شائع ہوئے، وہ کچھ تو ادبی ہیں، کچھ تاریخی، کچھ علمی اور کچھ مذہبی ہیں اور کچھ وہ خطبات ہیں جو انھوں نے کسی ادبی مجلس میں دئے، کچھ اردو سے متعلق مقالات اور کچھ اردو کی اہم کتابوں پر ان کے مقدمات ہیں، اس مقالہ میں ان کے ادبی مضامین کا مطالعہ زیادہ کرنا ہے۔

ان کے ادبی مضامین نقوش سلیمانی کے نام سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئے تھے اس میں پہلے ان کا وہ خطبہ ہے جو انھوں نے ۲۹ر دسمبر ۱۹۱۵ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ ترقی اردو کی صدارت کرتے ہوئے پڑھا تھا، وہ بڑے اچھے مورخ بھی تھے، تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی، اس لئے ان کی ادبی تحریروں میں بھی تاریخ کی گہری چھاپ ملتی ہے، اس میں وہ پہلے یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کا بڑا کارنامہ سب کو ملانا اور جوڑنا ہے، اس کا تمدن مصر، شام، عجم، روم اور یونان کے تمدنوں کا خلاصہ ہے، اس کے علوم و فنون ہندوستان، بابل، فارس، یونان اور اسکندریہ کے تجربہ خانوں اور درسگاہوں کا عطر ہیں، اس کی نسل تورانی، آریائی اور سامی قوموں کا مجموعہ ہے، اس کی زبان میں سنسکرت، پہلوی

قبطی، سریانی، لاطینی اور یونانی اصطلاحات کا ذخیرہ ہے' اسلام کی دنیا میں نسل، وطن، اور زبان کی کوئی تفریق نہیں' جس طرح دنیا کا ہر گوشہ اس کا وطن ہے' دنیا کا ہر لغت اسکی زبان ہے (ص ۳) لکھ کر کہتے ہیں کہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب کہ سندھ کے کناروں سے اٹلانٹک کے ساحل تک ایک زبان تھی جو ساری دنیا پر حکمرانی کر رہی تھی اور وہ قرآن کی زبان یعنی عربی تھی (ص ۳) ان کی اس رائے سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا ہے کہ عرب جس ملک میں گئے یا تو وہاں کی زبان بدل گئی اور بدل نہ گئی تو ان کی زبان کے الفاظ نے دیسی ملکوں کے الفاظ سے مل جل کر ایک نئی زبان کا ہیولیٰ تیار کر دیا' نئی فارسی، نئی ترکی، نئی طلائی' نئی بربری اور نئی ہندوستانی نے اسی طرح جنم لیا (ص ۴) اردو کی تاسیس پر مزید مورخانہ نظر اس طرح ڈالتے ہیں کہ مسلمانوں کا ہندوستان پر حملہ پہلی صدی ہجری کا واقعہ ہے اور یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس حملہ کی ابتدا مسلمانوں کے فاتحانہ جذبات کا نتیجہ نہ تھی جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے' بلکہ ایرانیوں کی اعانت کے لئے ہندوستان کی آمادگی ہے اور اس کا نتیجہ مسلمانوں کا حفظ ماتقدم کے طور پر سندھ کا قبضہ ہے' تقریباً اس کے چار سو برس کے بعد ترک اور ایرانی فتوحات کا سیلاب درۂ خیبر سے گذر کر ہمالیہ کے پانچ دریاؤں میں مل گیا، یہ اردو زبان کی تاریخ کا پہلا دن ہے (ص ۴ - ۵) پھر ایک کھلی حقیقت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ ایک ایسا ملک جو مختلف نسلوں' مختلف قوموں اور مختلف زبانوں کا مجموعہ تھا ناگزیر ہے کہ وہاں باہمی میل جول کے بعد ایک زبان پیدا ہو' وہ پیدا ہوئی اور اسی کا نام اردو ہے (ص ۵) اپنے اس دعوے کو مستحکم کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ اس کا پیدا ہونا ضروری اور مجبوراً تھا' مسلمان عربی اور فارسی زبان لے کر ہندوستان آئے' اس پر دو سو برس بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ ایک مشترک زبان یہاں پیدا ہوگئی' اردو شاہجہاں کے عہد کی

یادگار بتائی جاتی ہے' لیکن اصل یہ ہے کہ غوریوں' خلجیوں اور تغلقوں کے زمانہ میں یہ پیدا ہو چکی تھی' امیر خسرو کی زبان میں ہندی الفاظ اور کبیر داس کی زبان میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش اردو کی ابتدائی شکل کو ظاہر کرتی ہے' رفتہ رفتہ یہ آمیزش بڑھتی گئی اور فوجی معسکروں میں جو ہندوستان کی مختلف اقوام کا سب سے زیادہ مخلوط مجموعہ تھا یہ بولی زبان بن گئی اور اسی لئے عام لوگ اس کو اردو کہنے لگے' اردو ترکی زبان میں معسکر یعنی فوجی پڑاؤ کو کہتے ہیں' اسی بنا پر ہندوستان کی اس مشترک زبان کو اردو کہنا میں اصطلاح کی غلطی سمجھتا ہوں' اردو کے ابتدائی مصنفین نے اس کو ہمیشہ ہندی کہا ہے اور انگریزوں کی زبان میں اب تک اسکا نام ہندوستانی ہے (ص ۷) سید صاحب اردو زبان کی تاسیس کی ایک اور وجہ یہ لکھ کر بتاتے ہیں کہ بمبئی اور مدراس کے احاطوں میں ہر سو میل ایک مستقل زبان کی حکومت کا رقبہ ہے' گجراتی' مرہٹی' کنڑی' ٹامل' ٹیلگو' خدا جانے کتنی زبانیں ہیں' میں سمجھتا ہوں کہ یہی سبب ہے کہ اردو کی مشترک زبان کی ضرورت سب سے پہلے دکن میں محسوس ہوئی (ص ۸)

سید صاحب نے یہ ساری باتیں آج سے کئی قرن پہلے کہی تھیں' اب جب کہ اردو کی تاسیس کے سلسلہ میں بہت سی نئی چیزیں سامنے آرہی ہیں' ان کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے خطبے میں اردو کے متعلق جو چند اشارے کئے تھے وہ صحیح تھے اور ان ہی کے اجمال کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے' انھوں نے اس وقت تو یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ ہندوستان کی عام زبان ہے اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس زمانہ میں قومی تعصبات کے باوجود ہندوستان کے کونے کونے میں یہ بولی اور سمجھی جاتی ہے' پشاور مرشد آباد اور ڈھاکہ تک اسی کی عملداری تھی' گو بیچ بیچ میں پشتو' پنجابی' بنگالی اور ہندی

زبانیں بھی آڑے آجاتی ہیں (ص ۸) مگر اب تقسیم ہند کے بعد اس کا نقشہ کچھ اور ہو گیا ہے۔

اسی خطبہ میں یہ بھی فرمایا کہ اردو زبان اپنے قواعد و لغت کی تدوین میں سب سے زیادہ انگریز قوم کی ممنون ہے (ص ۹) اس سلسلہ میں اردو زبان بولنے والوں کو شرمندگی سے بچانے کی خاطر یہ معلومات فراہم کی ہیں کہ انگریزی زبان کی سب سے پہلی ڈکشنری ایک فرانسیسی نے لکھی، عربی زبان کے قواعد اور لغت کی تالیف سب سے پہلے اخفش، سیبویہ، اصمعی اور ابو علی فارسی وغیرہ نے کی جو سب کے سب عجمی تھے، اس بنا پر اگر نالن صاحب نے اردو کی سب سے پہلی ڈکشنری لکھی یا جان گلکرسٹ صاحب نے ہندوستانی قواعد کی کتابیں یا ڈی ٹاسی نے اردو ادبیات کی سب سے پہلی علمی تاریخ مرتب کی تو تعجب کی بات نہیں، (ص ۹) اسی کے ساتھ سید صاحب یہ بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ زبان کو تکلفات سے بری کر کے سادہ علمی اور تحریری زبان بنانا انگریزوں کی رہنمائی سے ہوا، ان کا خیال ہے کہ اس کو سادہ اور بے تکلف بنانے کا فخر مولانا اسماعیل شہید (سنہ ۱۸۳۱ - ۱۷۸۲ء) کو حاصل ہے، ان کی تقویۃ الایمان آج بھی فصاحت اور زبان کی سادگی کا بہترین نمونہ ہے، (ص ۹) وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ شاہ عبدالقادر کی موضح القرآن بھی بیان کی صفائی میں کم نہیں، اس کے بعد مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب کے خطوط کی زبان ہے جو غالب کے بقائے نام کا ان کے اردو اور فارسی دواوین سے زیادہ محفوظ ذریعہ ہے (ص ۹) پھر وہ بڑی فراخ دلی سے اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کا سب سے پہلا حقیقی مصنف جس نے زبان کو ہر قسم کی سیاسی، تعلیمی، مذہبی، علمی اور اخلاقی مباحث ومضامین کے قابل بنایا، سر سید کی ذات تھی (ص ۹)

اس خطبہ میں سید صاحب نے ہندی اور اردو کے جھگڑے کا بھی ذکر کیا اور اس کو ایک ناگوار قضیہ بتایا تھا (ص ۱۰) مگر اس ناگوار قضیہ میں اس وقت سے اب تک ہندوستان میں اردو، ہندی سے شکست کھا چکی ہے، انھوں نے ساٹھ برس پہلے یہ بات کہی تھی کہ اردو زبان ہندوستان کے ہر صوبہ میں ایک حریف مقابل سمجھی جاتی ہے، پنجاب میں اس کو پنجابی سے مقابلہ ہے، صوبہ متحدہ اور بہار میں ہندی زبان سے، اڑیسہ میں اڑیا زبان اسکی حریف ہے، بمبئی میں مرہٹی، سندھی، گجراتی اور کنڑی، چار پہلوانوں سے اس کا معرکہ ہے، مدراس میں ٹامل، تلیگو اور اردی سے دوچار ہے (ص ۱۰) انھوں نے اس سلسلہ میں اردو کو قلعۂ معلّی کا پہلوان کہا ہے (ص ۱۰) یہ پہلوان سب سے معرکہ آرائی میں آج بھی مشغول ہے مگر اس کے ہار ماننے کا امکان نہیں۔

انھوں نے اس خطبہ میں اپنی اس حقیقی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اردو زبان ہندوستان کے تمام باشندوں کی مشترک زبان قرار دی جائے، مگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور نہ آیندہ اس کی امید ہے، مگر ان کا یہ بھی پیام تھا کہ اگر بد قسمتی سے یہ مقصد حاصل نہ ہو سکے تو کم از کم اس کی کوشش ضرور ہونی چاہئے کہ وہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی مشترک زبان بن جائے کیونکہ صوبوں کی چھوٹی چھوٹی زبانیں اور بولیاں جہاں مسلمانوں کی ایک تعداد آباد ہے، ان کے لئے مذہبی، علمی اور تعلیمی سرمایہ فراہم نہیں کر سکتی ہیں (ص ۱۱) ان کے اس پیام پر آج بھی بڑی سنجیدگی سے غور کیا جا سکتا ہے، انھوں نے اب سے نصف صدی پہلے اس کی طرف توجہ دلائی تھی کہ اصول حکومت اور آئین عدل کی رو سے گورنمنٹ نے ہر احاطہ کی سرکاری اور دفتری زبان کو اس احاطہ کی عام ملکی زبان قرار دیا ہے جو کہیں بنگالی ہے کہیں مرہٹی ہے اور کہیں گجراتی ہے اور یہی وہاں کے سرکاری مدرسوں کی اہم اور سیکولر زبانیں ہیں،

اس حالت میں مسلمان لڑکے تنہا اردو لیں تو سرکاری دفتروں میں وہ کارآمد نہیں رہتے، اسلئے
وہاں ان کے لئے جگہ نہیں نکل سکتی اور اگر اردو نہیں لیتے تو وہ اپنے کو فنا کرتے ہیں، اور
اگر اردو اور دوسری دیسی زبان دونوں ساتھ لیں تو وہ اپنے مقابل کے ہم وطن طالبعلموں
کے مقابلہ میں کمزور رہتے ہیں (ص ۱۱) انھوں نے اپنی دور بینی اور مآل اندیشی سے
اس وقت جو یہ ساری باتیں کہی تھیں، ان سے ہندوستان کے اردو بولنے والے مسلمان
تقسیم ہند سے اب تک دوچار ہیں اور اس کا حل ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے مگر سید صاحب
نے اس کی پرزور وکالت کی ہے کہ ہر شخص کی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہونی چاہئے،
اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ دنیائے گذشتہ اور موجودہ میں سیکڑوں قومیں عروج و کمال
تک پہونچ چکی ہیں لیکن تاریخ اس مثال سے عاجز ہے کہ کبھی غیر زبان کی تعلیم قوموں کے
عروج اور ارتقاء کا باعث ہوتی ہے (ص ۱۴)

اس خطبہ میں اس پر بھی زور دیا گیا تھا کہ اردو کے لئے زبان کے اصول و قواعد کی تدوین
اور اس کے لئے قاموس، لغات اور ڈکشنریوں کی تالیف پر زیادہ توجہ صرف کی جائے (ص ۱۶)
ان کی یہ آواز صدا بصحرا نہ ہوئی اور اب تک اردو کے اچھے اچھے قواعد لکھے جاچکے ہیں اور
لغت پر اہم کام جاری ہے، اس موقع پر اپنے اس افسوس کا بھی اظہار کیا تھا کہ اردو میں
مذہب، تاریخ اور شاعری کے سوا ہر فن صفر یا قریب صفر کے نظر آئے گا (ص ۱۷) مگر
اس وقت سے اب تک صورت حال بہت کچھ بدل چکی ہے، انھوں نے اس کی طرف بھی
توجہ دلائی تھی کہ مسلمانوں کے نقطۂ خیال سے محقق ماخذوں کی بنا پر ہندوستان کے اسلامی
عہد کی تاریخ سیاسی اور علمی دونوں حیثیت سے نہایت ضروری ہے، مولوی ذکاء اللہ صاحب
مرحوم کی تاریخ ہندوستان انگریزی فکر و دماغ کا بالکل عکس ہے (ص ۱۸) ان کی یہ آواز

بھی سنی گئی، خود دار المصنفین کے اندر سید صاحب کی تحریک سے جناب سید صباح الدین عبدالرحمن
کی کوشش سے تاریخ ہند پر ۲۲ جلدیں لکھی جاچکی ہیں،

اس خطبہ کے اٹھارہ ۱۸ برس کے بعد یعنی ۱۹۳۳ء میں انھوں نے "ہندوستان میں
ہندوستانی" کے عنوان سے انجمن اردوئے معلّٰی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک مقالہ پڑھا،
جس میں ایک بار پھر اردو زبان پر بڑی پُرمغز بحث ہے، اس کے مطالعہ سے اندازہ
ہوتا ہے کہ انھوں نے مقالہ کیا لکھا تھا بلکہ ادب، تاریخ اور لسانیات کا ایک درس دیا ہے
اس میں علم کا عرفان، نظر کی وسعت، فکر کی گہرائی اور تحقیق کی گیرائی پورے طور پر نظر
آتی ہے، پوری تحریر میں بڑا وزن اور وقار ہے جس کے بارے قارئین پڑھتے وقت یہ
محسوس کرتے ہیں کہ ان کو کچھ سکھایا جارہا ہے اور وہ کچھ سیکھ
چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی محسوس کرتے ہیں کہ ان کو کچھ سکھایا جارہا ہے اور وہ کچھ سیکھ
رہے ہیں، ایسی باوزن اور باوقار تحریریں موجودہ دور میں کسی اور اہل قلم کے یہاں دیکھنے
میں نہیں آتی ہیں، ان کے یہاں وہ سنجیدگی، متانت اور بصیرت نظر نہیں آتی جو سید صاحب
کے یہاں ہے، وہ مغرب کے لٹریچر سے متاثر ہو کر وہاں کی لالٹینوں کی روشنی تو ضرور دکھا
دیتے ہیں مگر تحریر کو جاندار بنانے کے لئے جو عمق ہونا چاہئے وہ عموماً نہیں ہوتا، یہ حصہ سید صاحب
ہی کا تھا، اس مقالہ میں مسعودی کی مروج الذہب، البیرونی کی کتاب الہند، ابن ندیم
کی الفہرست ابن حوقل اور بشاری کے سفرنامے، مخدوم اشرف کچھوچھویؒ کے ملفوظات
کے مجموعہ لطائف اشرفی اور امیر خسرو کی غرۃ الکمال وغیرہ کے حوالے ہیں جن سے اردو
کے موجودہ لکھنے والے بالکل ناآشنا ہوچکے ہیں مگر سید صاحب نے ان ہی کی مدد سے ہندوستان
کی مختلف زبانوں اور خصوصاً اردو کی بڑی مفید تفصیلات پیش کی ہیں۔

سید صاحب لکھتے ہیں کہ ہندوستان مسلمانوں کی آمد سے پہلے چھوٹے چھوٹے بےشمار

ریاستوں کا ایک ایسا مجموعہ تھا جس کو کسی حیثیت سے ایک ملک نہیں کہہ سکتے تھے، زبان کے لحاظ سے اس ملک میں بھانت بھانت کی بولیاں تھیں۔ پیمائش لسانی کے محققین کے نزدیک اس میں آج بھی تین سو سے زیادہ بولیاں مروج ہیں، ان بولیوں کو چھوڑ کر یہاں صرف ممتاز زبانوں کو لیا جائے تو یہ تعداد دہائی سے کم نہ ہوگی، جن کے خط بھی مختلف ہیں، سید صاحب نے البیرونی کے حوالے سے ان رسم الخطوں کی نشان دہی یہ کہکر کی ہے کہ ایک خط سدھ ماترک کشمیر، بنارس اور مدھیہ پردیش یعنی آریا ورت میں جاری تھا، مالوہ کے حدود میں جو خط جاری تھا اس کو ناگر کہتے تھے اور یہ بھاٹیہ اور کچھ سندھ میں مروج تھا، ملواری خط جنوبی سندھ میں استعمال ہوتا تھا، کنٹری کرناٹک میں، انتری آندھرا میں، دروادی دراوڑ میں، لاری لار دیش یعنی گجرات اور کاٹھیاواڑ میں، گوڑی پورب دیش میں اور بیک شک، اودیسور میں رائج تھا (ص ۲۱ - ۲۳) اس ملک میں جو زبانیں بولی جاتی تھیں ان کے نام بھی سید صاحب نے مختلف کتابوں سے بڑی محنت سے جمع کئے ہیں اور وہ یہ تھیں: سندھی، لاہوری، کشمیری، بنگالی، گوڑی، گجراتی، تلنگی، معبری، دھورسمندری، اودھی، دہلوی، ملتانی، مارواڑی، مرہٹی، کرناٹکی، افغانی، بلوچستانی، کچھی، کنڑی، اڑیا، ٹامل، تیلگو، ملیالم، ترہتی، بھوجپوری، پنجابی، پالی، پراکرت، سنسکرت، ماگدھی، شورسینی، پیشاچی، اودھمک اور اپ بھرنش وغیرہ (ص ۲۴-۲۵)

سید صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے جب اس ملک میں قدم رکھا تو اس ملک کی زبانوں کی نیرنگی اور بھاشاؤں کی کثرت دیکھ کر متحیر ہو گئے، وہ اپنے ساتھ اپنی زبان بھی لائے، عرب عربی، ایرانی فارسی اور ترک و مغل ترکی، مگر ان سب پر فارسی اثر غالب تھا، یہ ممکن نہ تھا کہ تمام ہندوستان کی زبان فارسی کر دی جائے اور نہ یہ ممکن تھا کہ ہندوستان کے

کسی صوبہ کی زبان کو اختیار کر کے اسے پورے ملک پر محیط کر دیا جائے، اس لئے قدرتی طور پر ہوا کہ مسلمان جس صوبہ میں گئے وہاں کی صوبہ وار زبان اختیار کی، ساتھ ہی مذہبی، سیاسی، تمدنی، صنعتی، تجارتی اور علمی ضرورتوں سے اپنی زبان کے سیکڑوں ہزاروں الفاظ اس ملک کی زبان میں مجبوراً بڑھائے، ہندوستان کی بولیوں میں ان کے مرادفات کی تلاش بیکار تھی، وہی الفاظ ہندوستان میں رائج ہو گئے (ص ۲۶) ایسے کچھ الفاظ کی ایک فہرست سید صاحب نے دے کر ہمارے ذہن کو ان کی طرف منتقل کیا ہے، وہ مذہبی، تمدنی، معاشرتی، سیاسی اور کاروباری الفاظ یہ ہیں، ان کا جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا: اللہ، ایمان، نماز، روزہ، حج، دعا، خیرات، رسول، پیغمبر، وحی، دوزخ، بہشت، بادشاہ، وزیر، صوبہ دار، قاضی، دیوان، تحصیلدار، ضلع دار، کارندہ، گماشتہ، واصل باقی نویس، خزانچی، پیشکار، سررشتہ دار، محافظ دفتر، جمع بندی، مالگذاری، جمع خرچ، روزنامچہ، انگور، سیب، انار، بہی، خربوزہ، تربوز، سردہ، بادام، منقی، کشمش، پستہ، شفتالو، ناشپاتی، خوبانی، چلغوزہ، پلاؤ، فیرنی، بریانی، زردہ، قورمہ، شوربا، کباب، قیمہ، کوفتہ، حلوا، شربت، فالودہ، برف، آبخورہ، چپاتی، بالوشاہی، قلاقند، برفی، شکرپارے، خورمے، نقل، چینی، زعفرانی، مخمل، کمخواب، تن زیب، چارخانہ، کامدانی، کرتہ، چکن، مرزائی، نیم آستین، پاجامہ، ازار، توشک، لحاف، فرش، قالین، مسند، بستر، رضائی، دولائی، تکیہ، غلاف، چادر، رومال، موزے، ازاربند، کمربند، پان دان، اگالدان، خاصدان، دیگ، دیگچی، چمچہ، رکابی، پیالہ، صابون، باورچی، رکابدار، خانساماں، دیوارگیر، قندیل، فانوس، یچق، چلمن، پردے، سوار، شہسوار، پہنچی، عقیق، فیروزہ، سنگ مرمر، دست بند، جہانگیری، بازو، نونگے، جوشن،

ہیکل، طوق، تعویذ، گلوبند، زنجیر، کمرزیب وغیرہ (ص ۲۶ - ۳۰) اس کے بعد سید صاحب اردو کی تاسیس کے سلسلہ میں یہ دلائل پیش کرتے ہیں کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہونچے ہیں، اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا، کیونکہ عربی وفارسی بولنے والے مسلمان تاجر، عراق، سیراف اور بصرے نکل کر سندھ کے بندروں سے گذر کر گجرات ہوکر بحر ہند کے کنارے سفر کرتے تھے، انکے میل جول سے یہ نئی زبان بنی جس میں تمام فعل اور حروف ہندوستان ہی کی بولیوں کے ہیں، البتہ آدھے اسما مسلمانوں کے لائے ہوئے ہیں، سندھی کے بعد ملتانی اور پنجابی زبانوں پر مسلمانوں کا اثر پڑا، یہ بولیاں موجودہ اردو کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں، بلکہ موجودہ اردو ان ہی بولیوں کی ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ شکل ہے، اردو کا آغاز ان ہی بولیوں میں عربی وفارسی کے میل سے ہوا اور آگے چل کر دارالسلطنت کی بولی سے جس کو دہلوی کہتے ہیں مل کر معیاری زبان بن گئی اور پھر دارالسلطنت کی بولی معیاری زبان بن کر تمام صوبوں میں پھیل گئی، ہندوستان میں کسی ایک متحدہ زبان کی ضرورت جتنی سلطنت کو محسوس ہوئی تھی اس سے کہیں زیادہ عوام کو اور ان سے زیادہ صوفیوں کو تھی جو ہر بولی کے انسانوں تک پہونچنا اپنا فرض سمجھتے، چنانچہ خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ، شیخ نصیرالدین اودھیؒ، خواجہ بندہ نواز دکنیؒ، شیخ شرف الدین منیری بہاریؒ، مخدوم اشرف کچھوچویؒ، شیخ علاؤالدین بنگالیؒ، مخدوم عبدالحق ردولویؒ، شیخ عبدالوہاب متقیؒ اور شیخ علی متقیؒ کے یہاں اس زبان کے اثرات ملتے ہیں۔

سید صاحب نے ان تمام باتوں کو مستند حوالہ جات اور مفید علمی معلومات اور اقتباسات فراہم کرکے ایسے مدلل اور محققانہ انداز میں لکھا ہے کہ ان سے کہیں کہیں اختلاف تو کیا

جاسکتا ہے، لیکن مجموعی حیثیت سے ان کے دلائل کو رد کرنا آسان بھی نہیں، ان کی اپنی تحقیق یہ تھی کہ شروع میں اردو کا نام اردو نہ تھا، یہ کہیں دہلوی، کہیں دکھنی کہیں گوجری، اور کہیں ہندی وہندوی کہیں قلعۂ معلی کے لحاظ سے اردوے معلی کہلائی، اس کی تائید میں یہ لکھتے ہیں کہ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلویؒ اور مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے قرآن پاک کا جس زبان میں ترجمہ فرمایا، اُس کو انھوں نے ہندی ہی کہا (ص ۶۰) یہ تمام باتیں لکھکر سید صاحب فرماتے ہیں:۔

"انگریزوں نے دہلی کے اردوے معلی کو اجاڑ کر جب کلکتہ کے فورٹ ولیم میں اپنا نیا اردوے معلی بناکر کھڑا کیا، تو ان کو اپنے ہم قوم عہدہ داروں اور تعلیمی اداروں کی خاطر ملکی زبان کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی، مگر ساتھ ہی ساتھ ان کو یہ بھی معلوم تھا، کہ اگر ان کو ہندوستان میں حکومت کرنا ہے، تو اس متحدہ قومیت کے درخت پر جو صدیوں کی خونریزی سے سینچ کر تیموریوں کی باغبانی سے تیار ہوا تھا، پہلے کلھاڑی مارنا ضروری ہے، اس کے لئے ضرورت تھی، کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے امتیازات کے حدود کو جس قدر ممکن ہو ابھارا جائے، چنانچہ فورٹ ولیم میں اردو اور ہندی کے نام سے دو شعبے قائم ہوئے، ایک مسلمانوں کے سر منڈھا، اور دوسرے کو ہندوؤں کے سر مڑھا، اور اس کا نام علمی قدردانی اور ادب نوازی رکھا، اور دونوں زبانوں میں کتابیں لکھوا لکھوا کر لوگوں میں تقسیم کی گئیں، یہ ہے آغاز اس انجام کا، جو آج اردو ہندی کے مہابھارت کی صورت میں ملک میں قائم ہے۔" (ص ۶۱)

سیّد صاحب کے لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر انگریز بیچ میں نہ ہوتے، تو اس ملک کی زبان ایسی بنتی جس کو ہندو اور مسلمان دونوں گوارا کرتے، اور ان دونوں میں زبان کا جھگڑا نہ پیدا ہوتا، اور ملک میں ایک ایسی زبان نمودار ہوتی، جس کو ہندوستانی کہنا صحیح ہوتا، اس میں فعل اور حروف تو ہندوستان کی بولیوں ہی کے ہوتے، کچھ اسماء عربی اور فارسی سے لئے جاتے، مگر انگریزوں نے اردو اور ہندی کا جھگڑا پیدا کر کے دو مستقل زبانیں بنا دیں، اس رائے میں بہت کچھ وزن ہے،

سید صاحب اپنے مضامین میں برابر اس کا اظہار کرتے رہے کہ اُردو کا نام اگر ہندوستانی ہو جاتا تو اُردو اس ملک کی مشترکہ زبان کی لڑائی جیت لیتی، مگر ایک غیر ملکی لفظ کے نام کے ساتھ مشہور ہوئی تو اس کے مخالفین اس کو ایک غیر ملکی زبان سمجھنے اور سمجھانے کی مہم پر اتر آئے، جس سے اس کو غیر معمولی نقصان پہنچا اور پہنچ رہا ہے، اس رائے میں بھی بڑی حقیقت ہے،

سیّد صاحب کو جہاں اپنی مادری زبان اردو سے محبت تھی، وہاں ان کو اپنے وطن سے بھی لگاؤ تھا، اس لئے انھوں نے اپنے ہم وطنوں کو مشورہ دیا کہ ہندوستان کو اگر ایشیا کے دوسرے ملکوں کے ساتھ اپنے تعلقات برقرار رکھنے ہیں تو اس کو اپنی جس زبان کے ذریعہ سے ان تعلقات کا رشتہ مضبوط کرنا ہوگا وہ اردو ہے، اس کی ایک سمت میں کابل اور بلوچستان سے لے کر بغداد تک فارسی حکمراں ہے، دوسری طرف سواحل عرب و افریقہ سے لے کر جبرالٹر تک عربی پھیلی ہوئی ہے، تمام بیرونی قوموں کے لئے ہندوستان کی جس زبان کا سیکھنا نہایت آسان ہے، وہ اردو ہے، یہی سبب ہے کہ یہ زبان ان تمام ملکوں اور جزیروں میں آسانی کے ساتھ پھیل گئی ہے،

جہاں ہندوستانیوں کی آمد و رفت ہے، برما، سیلون، آسام، مالدیپ، انڈمان، ماریشس، سنگاپور، پورٹ بلیر، اور افریقہ کے ان تمام مختلف ملکوں میں جہاں جا کر ہندوستانی بسے ہیں، اس زبان کو اپنے سینوں سے لگا کر ساتھ لے گئے ہیں، ادھر سواحل عرب میں عدن، جدہ، بلکہ مکہ معظمہ تک اس زبان میں بات چیت ہوتی ہے (ص ۶۷-۶۶) سید صاحب نے یہ بات چوالیس (۴۴) سال پہلے کہی تھی، اور اب جب کہ ہندی ہندوستان کی قومی زبان بن چکی ہے، اور اس کی ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش ہو رہی ہے، اس نئے ماحول میں بھی سید صاحب کے یہ مشورے نظر انداز نہیں کئے جا سکتے، اور اگر فراخدلی کو راہ دی جائے، تو یہ مشورہ اب بھی قابلِ قبول سمجھا جا سکتا ہے،

اس مقالہ میں سید صاحب نے اردو بولنے والوں کو حسب ذیل مفید مشورے بھی دیئے:-

۱- اس زبان کا نام اردو کے بجائے ہندوستانی رکھا جائے، دنیا کی اکثر زبانوں کا نام ملک یا قوم کے نام سے منسوب ہوتا ہے، اردو کا نام اس ملک و قوم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، ایسا اجنبی نام جس سے قومی و ملکی جذبہ کو کوئی تحریک نہ پہنچے، احترام کے قابل نہ،

(۲) اردو بول چال اور تقریر و تحریر میں اب تک عربی و فارسی کے جو الفاظ آکر مل چکے ہیں، وہ ہماری زبان کا جزو بن چکے ہیں، مگر ان کے علاوہ فرہنگ اور قاموس دیکھ دیکھ کر نئے لفظوں کو اب اس زبان میں رواج دینے سے پرہیز کرنا چاہئے، الّا یہ کہ علمی اصطلاحات یا کسی نئی چیز کے نام رکھنے کے لئے کسی نئے لفظ کی مانگنی مانگنے کی ضرورت پیش آئے،

۳- لفظوں کی عربی اور فارسی جمع اور واؤ عطف اور فارسی اضافتوں سے جہاں تک

ہوسکے بچا جائے، ان کی جگہ ہندوستانی جمع اور عطف و اضافت کو رواج دیا جائے،

۴۔ ہندی کے ان لفظوں کو جو ہندوستانی یعنی اردو میں کھپ سکتے ہیں، کھپانے میں ضد اور ہٹ سے کام نہ لیا جائے، غالب اور مومن سے پہلے ہماری شاعری میں ہندی کے سیکڑوں اچھے اور پیارے لفظ تھے، جن کو ٹکسال سے بے سبب باہر کر دیا گیا ہے،

پہلا مشورہ یعنی اردو کا نام ہندوستانی ہو، اردو بولنے والوں نے تو قبول نہیں کیا لیکن دوسرے مفید اور خیرخواہانہ مشورے قابلِ قبول سمجھے گئے، اور ان پر بڑی حد تک عمل ہو رہا ہے،

یہ مقالہ، ۵ صفحے میں ختم ہے، لیکن اس کو لکھنے میں سید صاحب نے ادب کو تاریخ اور تاریخ کو ادب بنا دیا ہے، اس کے پڑھنے میں تاریخ اور ادب دونوں کا لطف ملتا ہے،

۱۹۳۶ء میں سید صاحب نے ہندوستانی ایکاڈیمی الہ آباد کی پانچویں اردو کانفرنس کی صدارت لکھنؤ میں کی، اپنے خطبہ میں لکھنؤ میں اردو زبان و ادب کی جو سرگرمیاں شروع سے ہوتی رہیں، اس کا جائزہ اس مبصرانہ اور فاضلانہ انداز میں لیا، کہ اس شہر کی پوری ادبی اور علمی تاریخ سامنے آجاتی ہے، یہ خطبہ اُن کی تحریر کے ایجاز کے آرٹ کا بڑا عمدہ نمونہ ہے، اپنے خطبہ میں پہلے تو اردو کے ان مشاہیر کا ماتم کرتے ہیں، جن کی وفات اسی سال ہوئی تھی، مختصر طریقے پر ان کے ادبی اوصاف کا ذکر اس طرح کیا ہے، کہ ان کا اختصار دوسرے کی تفصیل پر بھاری پڑتا ہے، مثلاً پریم چند کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ ہمارے ملک کے دیہاتیوں کے دل اور زبان تھے، دیہات کے دکھ درد کو ان کا دل جو محسوس کرتا تھا وہ ان کے قلم کی زبان سے ادا ہوتا تھا، سادہ فقرے، بے تکلف بیان، لیکن درد اور تاثیر میں ڈوبی ہوئی کہانی اُن کا

قلم ہمارے پرانے کیرکیٹر اور قومی آن بان کا سچا قدردان تھا (ص ۷۸) پریم چند کی افسانہ نویسی اور ناول نگاری کی یہ کیسی صحیح مرقع آرائی ہے۔

اصغر مرحوم کو یاد اس طرح کرتے ہیں کہ ان کا پہلا دیوان نشاط روح اعظم گڈھ سے مطبع ہوکر نشاط عالم کا باعث ہوا، وہ ہماری زبان کے ان شعرا میں سے تھے جنھوں نے ہندوستانی زبان کی موجودہ شاعری کا رخ پلٹا ہے اور ایک نئے دورِ سخن کا آغاز کیا ہے (ص ۸۰) اس رائے سے بھی کسی کو اختلاف نہ ہوگا۔

نور اللغات کے مرتب نور الحسن نیر کے بارہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ وہ ایک بڑے باپ کے بیٹے تھے، خود بھی شاعر سے بڑھ کر محقق فن تھے، ہماری زبان میں فرہنگ آصفیہ کے بعد دوسرا مکمل لغت نور اللغات ان ہی آزمودہ کار ہاتھوں نے ترتیب دیا (ص ۷۸) چند سطروں میں کیسی جامع تعریف ہے۔

لکھنؤ کے مایۂ ناز ادیب، شاعر اور مصنف نواب حسام الملک سید محمد علی حسن خاں طاہر کا ماتم اس طرح کرتے ہیں کہ ان کے قلم اور زبان نے کم از کم پچاس برس تک شعر و سخن اور علم و ادب کا ہنگامہ برپا رکھا (ص ۸۰) ہنگامہ برپا رکھا لکھ کر نواب صاحب کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا نقشہ پیش کر دیا ہے۔

سید صاحب نے اس خطبہ میں اعتراف کیا ہے کہ لکھنؤ ہی کی گود میں ان کے ہوش و تمیز کی آنکھیں کھلیں، اسی کے دامن میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی، اسی کی آب و ہوا میں ان کی علمی و ادبی نشو و نما ہوا، اس لئے اس سرزمین کا ہر گوشہ ان کے لئے مانوس اور اس چمن زار کی ہر کیاری ان کے لئے نظر افروز ہے، اسی لئے اس مانوس چمن زار اور نظر افروز سرزمین کی علمی خدمات کے ذکر میں ان کے قلم میں بڑی شگفتگی بلکہ وارفتگی پیدا ہوگئی ہے، اس کو

یہاں ذیل میں اختصار سے اس لئے پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ سید صاحب نے لکھنؤ کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا جو ذکر کیا ہے وہ ناظرین کے سامنے آجائے اور اسی کے ساتھ جس انشا پردازانہ انداز میں اس کو لکھا ہے اس سے بھی ناظرین محظوظ ہوں، لکھنؤ کی اہمیت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں

"دلی کے باغ میں جب خزاں آئی تو یہاں بہار کا دور آیا، اس اجڑے باغ کے کتنے مرغ خوش لحن تھے جنھوں نے اڑ اڑ کر اس چمن کی شاخوں پر بسیرا لیا، ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو سندھ اور پنجاب میں ہوئی، نشو و نما دکن میں پایا، تعلیم و تربیت دلی میں حاصل کی، لیکن تہذیب اور سلیقہ یہیں لکھنؤ میں سیکھا" (ص ۷۹)

یہاں کی پرانی ادبی اور علمی مجلسوں کے ذکر میں ان کا قلم اور بھی رواں ہوگیا ہے:

"اودھ کی راجدھانی جب فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوئی تو اس کو اور چار چاند لگ گئے، میر تقی میر، انشاء اللہ خاں انشا، جرأت اور مصحفی وغیرہ نے ادھر کا رخ کیا، میر انیس کا خاندان پہلے ہی آچکا تھا، ان بزرگوں کے دم قدم سے بادشاہوں کے دربار، امراء کی ڈیوڑھیاں اور اہل علم کی محفلیں شعر و سخن کے نغموں سے پرشور بن گئیں، ناسخ و آتش وزیر و صبا اور ان کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں نے شعر و ادب کے جواہر ریزوں کے ڈھیر لگا دئے، شعر و سخن کے چرچوں اور شاعروں کے تفریحی جگھٹوں کو چھوڑ کر نفس زبان کی ترقی، محاورات کی نزاکت، الفاظ کی تراش خراش اور اصول و قواعد کے وضع و تالیف کا جو اہم کام گذشتہ دو صدیوں میں یہاں انجام پایا، اسی کا اثر ہے کہ اس نے بولی سے بڑھ کر زبان کا درجہ پایا، ملک سخن کے دو اخیر فرماں روا انیس و دبیر نے شاعری نہیں کی بلکہ اپنے نام سے زبان و ادب کے سکے ڈھال ڈھال کر اہل ملک میں تقسیم کرتے رہے" (ص ۷۸ - ۷۹)

لکھنؤ میں زبان کی جو خدمت ہوئی اس کو سید صاحب اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ہم نے

زبان کی نزاکت و لطافت میں وہ کام کیا جو ہر ایک ہوشیار جوہری جواہرات کے نوک پلک نکال کر جلا دینے میں کرتا ہے، ان کے شاگرد والا جاہ میر اوسط علی رشک نے صحیح و غلط اور سبک لفظوں کو اس طرح پرکھ کر الگ کر دیا کہ ان کی پسند فصاحت کا معیار بن گئی، سیکڑوں الفاظ جو بول چال میں رائج تھے مگر شعر و انشا کی بارگاہ میں ان کو بار حاصل نہ تھا، ان کو خود اپنے شعروں میں نظم کر کے پچھلوں کے لئے سند پیدا کی، لکھنؤ میں یہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۲۵۶ھ میں اردو لغت ترتیب دیا جس کا نام نفس اللغۃ ہے، سید انشا اللہ خاں کے دریائے لطافت کا دھارا بھی یہیں بہا، شیخ امداد علی بحر المتوفی ۱۳۰۰ھ کی نسبت بھی مشہور ہے کہ انھوں نے کوئی لغت لکھا تھا مگر اس کا سراغ نہیں ملتا، حکیم ضامن علی جلال نے زبان کو نہ صرف شاعری بلکہ وضع اصول اور تحقیقات کے لحاظ سے مالا مال کیا ہے، سرمایۂ زبان اردو، مفید الشعرا، مجمع اللغات، گلشن فیض اور قواعد المنتخب وغیرہ ان کی وہ کتابیں ہیں جو اردو زبان کا سرمایہ ہیں، منشی امیر احمد امیر مینائی کے شاعرانہ خدمات سے قطع نظر امیر اللغات کے مصنف کی حیثیت سے ہماری زبان پر ان کا بہت بڑا احسان ہے (ص ۸۱ - ۸۰)

سید صاحب نے اپنے اس خطبہ میں لکھنؤ کی وہ خدمتیں بھی گنائی ہیں جن کو لوگ اب تک بھول چکے تھے، اس سلسلہ میں انھوں نے جو معلومات دئے ہیں وہ بہت قیمتی ہیں، مثلاً یہاں نواب سعادت علی خاں کے دور میں علامہ تفضل حسین خاں نے جدید علم ہیئت اور جبر و مقابلہ میں کئی کتابیں تصنیف کیں، نواب محمد علی خاں کے زمانہ میں منشی الملک، فخر الدولہ، دبیر الملک، ہشیار جنگ رتن سنگھ زخمی نے علم ہیئت میں حدائق النجوم لکھی اور اس نئے علم کے لئے نئی اصطلاحات وضع کیں، راے منوں لال فلسفی، نواب آصف الدولہ کے دربار میں نوکر تھے، انھوں نے علم حساب، جغرافیہ، ہیئت اور

حکمت، انگریزی ہیں رسائل یادگار چھوڑے، نواب نصیر الدین حیدر کے عہد میں مولوی محمد اسماعیل اور مولوی محمد حسین لندن بھیجے گئے، ان دونوں نے یورپ کے جدید علوم و فنون سے اہل ملک کو آشنا کیا، شاہان اودھ ہی کے زمانہ میں ایک دار الترجمہ قائم ہوا، یہاں سے ہیئت، کیمیا، مناظر، طبیعیات، قوت مقناطیسی، علم الماء، علم الہواء، علم الحرارت پر انیس[19] رسالے ترجمے کر کے شائع کئے گئے۔ لارڈ بردم کی ایک انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ مقاصد العلوم کے نام سے محمد علی شاہ کے زمانے میں چھپا۔ لکھنؤ کی اس علمی و تعلیمی مجلس کا نام اسکول بک سوسائٹی تھا (ص ۸۳۔ ۸۴)

سید صاحب نے اس طرف بھی توجہ دلائی تھی کہ دلی سوسائٹی اور فورٹ ولیم کالج کے ساتھ اس اسکول بک سوسائٹی کا نام بھی لیا جائے اور اس کی مطبوعات کا پتہ لگایا جائے، مگر اب تک اس سوسائٹی پر خاطر خواہ کام نہیں ہو سکا ہے۔

سید صاحب نے لکھنؤ کی ادبیات میں داستان امیر حمزہ، نوشیرواں نامہ، طلسم ہوش ربا، ایرج نامہ کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ یہ ہماری پرانی زبان کے بہترین نمونے ہیں (ص ۸۵) پھر نثر میں سرور کے فسانۂ عجائب اور نظم میں نواب مرزا شوق اور دیا شنکر نسیم کی مثنویوں سے متعلق اپنی یہ رائے لکھی ہے کہ یہ وہ جواہر پارے ہیں جن سے کبھی ادب اردو کی الماریاں سجائی جاتی تھیں، امانت کی اندر سبھا کے متعلق وہ رقمطراز ہیں کہ مدتوں تک یہ اہل شوق کا تماشہ گاہ بنا رہا۔ پھر لکھنؤ میں جو ناول لکھے گئے ان کے متعلق اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ عبد الحلیم شرر نے قومی تاریخ اور اصلاح معاشرت کے بعض موضوعات کو اور سرشار نے لکھنؤ کے آخری تمدن، رسم و رواج اور طور و طریق کو مرزا رسوا نے ایک خاص حلقے کی خصوصیات کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ انیسویں صدی کا آخر عہد

ان ہی کے دم قدم سے پُر رونق تھا۔ لکھنؤ کے اس ادبی دور میں سرشار کی سیر کہسار اور فسانۂ آزاد، شرر کی فردوس بریں اور مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا اور سجاد حسین کی حاجی بغلول ادب اردو کی بہترین کتابیں ہیں (ص ۸۶)

سید صاحب نے لکھنؤ کے مطبعوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کے جو نام دئے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کھوج لگا کر اپنی تحریروں کو کس قدر باوزن بناتے تھے۔ جو مطبعے بھلا دئے گئے تھے ان کے یہ نام گنائے ہیں۔ مطبع سلطان، مطبع محمدیہ، مطبع علوی، مطبع مصطفائی، مطبع محمدی، مطبع جعفریہ، مطبع امینی، مطبع صدیقی، نول کشور پریس، سید صاحب نے ان میں مطبع مصطفائی اور نول کشور پریس کی بہت تعریف کی ہے، لکھتے ہیں: مطبع مصطفائی اپنی صحت اور صفائی میں معیار کے بلند درجے پر تھا۔ اس کی چھپی ہوئی کتابیں اہل شوق میں اشرفیوں کے مول خریدی جاتی تھیں، نول کشور پریس نے مشرقی علوم و فنون کی جتنی ضخیم اور کثیر کتابیں شائع کیں، ان کا مقابلہ ہندوستان کیا، مشرق کا کوئی مطبع نہیں کر سکتا تھا، میر، سودا، ناسخ، آتش، جرأت، مصحفی، انشا، رند، وزیر، صبا، انیس، دبیر، مونس، اسیر اور امیر وغیرہ کے دیوان اور کلاموں کے مجموعے اسی مطبع سے نکل کر دنیا کا اجالا ہوئے اور ملک کے گوشے گوشے میں زبان کی اشاعت کا سبب بنے (ص ۸۶۔ ۸۷)

لکھنؤ کے اخبارات میں اودھ اخبار، اودھ پنچ، مشیر قیصر، آئینۂ آزاد اور ہندوستانی اور مسلم گزٹ کا ذکر کیا ہے، اودھ اخبار کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ اس اخبار نے اس ملک کے مشہور ادیبوں کے پیدا کرنے اور ان کو پروان چڑھانے میں بہت بڑا حصہ لیا، سرشار اور شرر دونوں اسی اخبار کے ذریعہ شہرت کے اسٹیج پر آئے، اودھ پنچ کو اردو کا سب سے پہلا کامیاب مزاحیہ اخبار قرار دیا ہے، جس کے صفحات میں ان کی رائے کے مطابق منشی احمد علی کسمنڈوی

منشی احمد علی شوق، میر اکبر حسین اور نواب سید محمد آزاد وغیرہ ہماری زبان کے وہ پرانے ادیب جو نئے طور طریق سے آگاہ تھے، روشناس ہوئے (ص ۸۸)

لکھنؤ کے رسالوں پر جو تبصرہ ہے وہ گو بہت مختصر ہے لیکن جامع تبصرہ کا بہت ہی اچھا نمونہ ہے۔

رسالہ محشر۔ یہاں کا سب سے پہلا ادبی رسالہ ہے جو مولوی عبد الحلیم شرر کا بھی پہلا ادبی کارنامہ تھا۔ یہ ۱۸۸۲ء میں نکل کر دو سال کے بعد بند ہو گیا۔

رسالہ دل گداز۔ ۱۸۸۲ء میں عبد الحلیم شرر نے نکالا جو اپنے زمانہ میں جدید طریقہ کا بہترین معیار تھا، یہی وہ رسالہ ہے جس نے ملک میں اردو کے بے شمار ادیب اور نثار پیدا کئے، نثر نویسی کا سلیقہ سب سے پہلے شرر ہی کی تحریروں سے ہمارے نوجوانوں میں پیدا ہوا۔

پیام یار۔ منشی نثار حسین کا یہ گلدستہ ایک زمانہ میں شوق کے ہاتھوں سے لیا اور عزت کی آنکھوں سے پڑھا جاتا تھا، اس میں اس عہد کے بڑے بڑے شعراء، امیر، داغ، جلیل اور تسلیم وغیرہ اور ان کے باکمال شاگردوں کی غزلیں چھپتی تھیں، انیسویں صدی کے اواسط میں حسن و عشق کا تنہا پیامبر تھا، جس کی باتوں کو سن کر خدا جانے کتنوں کو عروس سخن کا شیدائی بننا پڑا اور صحیح زبان کے سیکھنے اور لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔

مرقع عالم۔ یہ حکیم محمد علی خاں کی ایڈیٹری میں ہردوئی سے نکلتا تھا، اس کو دل گداز کا حریف سمجھنا چاہئے، حکیم صاحب ناول نویسی میں بھی اپنے وقت میں شہرت رکھتے تھے ان کا قلم وقت کا سماں دکھانے میں خاص ملکہ رکھتا تھا (۸۹)

(باقی)

مولانا شاہ محمد بدر الدینؒ

از

جناب مولوی محمد عاصم صاحب قادری ندوی

(۲)

فقہی تحقیقات

مولانا کی فقہی تحقیقات، ارباب علم و افتا، کے لئے بصیرت افروز ہوتی تھیں ان تحقیقات میں اسباب و علل کی مجتہدانہ بحث اور اسرار و مناط کے تجزیہ سے فکر و نظر کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں اور سنت نبوی کی حقیقی معنویت، منفرد فقیہانہ لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں علمائے ہند اس کے روادار نہ تھے کہ خطبۂ جمعہ کی ضروری باتوں کا ترجمہ اثنائے خطبہ میں پڑھ دیا جائے، وہ عربی خطبہ میں کسی غیر زبان کی آمیزش گناہ اور عمل سلف کے خلاف سمجھتے تھے۔

آپ نے ۱۹۲۱ء میں سب سے پہلے اس مسئلہ پر مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ روشنی ڈالی اور ایک مدلل و مبسوط مقالے میں زیر بحث مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا استقصار کر کے اپنی تحقیق پیش کی، اگرچہ یہ رائے عام علماء کے مسلک کے خلاف تھی، مگر اس کے اظہار میں آپ کو بالکل تامل نہ ہوا، اپنی تحقیق کی صحت پر مکمل اعتماد رکھتے تھے اس مقالہ کی اشاعت کے بعد اگرچہ علماء کے درمیان اتفاق عام نہ ہو سکا مگر اس مسئلہ پر عمل کرنے والوں کو تقویت ہو گئی، ذیل میں آپکی تحریر ملاحظہ ہو:

"خطبہ جمعہ کا ہو یا عیدین، یا کسوف وخسوف یا استسقاء کا، عربی زبان میں پڑھنا سنت ہے اور دوسری کسی زبان میں پڑھنا خلافِ سنت ہے، فقہاء نے ایسا ہی لکھا ہے۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے ہر موقع اور ہر موسم کے احادیث کی کتب میں منقول ہیں آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم بھی عربی زبان میں خطبے پڑھا کئے، حالانکہ اشاعت اسلام کے لئے یہ بزرگوار شام، مصر، فارس بلکہ افریقہ کے بعض حصوں تک پہونچ گئے تھے، لیکن ہر ملک، ہر شہر اور ہر قریہ میں اپنی ہی زبان عربی میں خطبے پڑھتے رہے، یہ دلیل ہے عربی میں خطبہ پڑھنے کے سنت متوارثہ ہونے کی، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ خطبہ کس غرض سے پڑھنا مقرر کیا گیا ہے، اس کا فائدہ خطبہ پڑھنے والے کے لئے مخصوص اسی کی ذات تک محدود ہے یا سننے والوں کیلئے مخصوص، یا دونوں کا نفع اس میں ہے، ظاہر ہے کہ نفع دونوں کا ہے لیکن پڑھنے والے کی غرض یہی ہونی چاہئے کہ سننے والوں کو اس خطبے سے نفع پہونچے۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم الٰہی تھا: وعظهم وقل لهم فی انفسهم قولاً بلیغا۔ (اے خاتم النبیین آپ ان کو نصیحت کریں اور ایسی بات کہیں جو ان کے دلوں میں اثر کرنے والی ہو)

اس جہت سے آپ کے خطبے لوگوں کی حالت کے موافق، ان کے ادراک اور سمجھ کے مطابق اور مواقع اور موسم کے مناسب ہوتے تھے، خود آپ اور آپکے اصحاب کی زبان عربی تھی تو عربی میں خطبہ کا ہونا لازم تھا۔ آج کل بھی اگر اسی

مناسبت سے سننے والوں کی حالت اور سمجھ کی رعایت کرکے سننے والوں کی زبان میں خطبے پڑھے جائیں تو گو زبان کی حیثیت سے وہ خطبہ سنت نہ ہو لیکن معنیٰ اور مفاد کی حیثیت سے وہ خطبہ سنت سے خارج بھی نہ ہوگا اور اس معنی میں سنت بھی ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سامعین کی اور اپنی متحد زبان میں خطبہ فرمایا ہے، تو جو خطیب اپنی اور سامعین کی متحد زبان میں خطبہ کہے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور اللہ تعالیٰ کے حکم وقل لهم فی انفسهم قولاً بلیغا کی تعمیل کرنے والا بہ نیابت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوگا، اس کے خلاف میں ہرگز یہ ادائے نیابت حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سے نہ ہوگی۔

یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اصحاب رسول نے نومسلموں کی رعایت سے ان کی زبان میں خطبہ کیوں نہ پڑھا، اس کا جواب یہ ہے کہ اصحاب رضی اللہ عنہم دوسری زبان نہ جانتے تھے، ایک ملک میں انھیں قرار بھی نہ تھا، کبھی شام میں تو کبھی مصر میں ...... کبھی فارس میں، اور حاضر کی زبان میں کوئی آدمی وعظ کہنا چاہے تو جب تک اس زبان میں پوری مہارت حاصل نہ کرے وعظ نہیں کہہ سکتا، اسلئے اصحاب مجبور تھے کہ اپنی ہی زبان میں وعظ کہیں۔

دوسرے یہ کہ جس قدر لوگ مسلمان ہوئے تھے، احکام شریعت کی تعلیم انھی اصحاب سے پاتے رہتے اور بیشتر اوقات ان کے ہم جلیس رہنے کے سبب سے کچھ کچھ عربی سمجھ لیتے تھے۔

تیسرے یہ کہ عام دستور ہے کہ فاتحین اپنی زبان کی ترویج چاہتے ہیں [illegible]

وعظ میں جو کچھ کہنا ہوتا ہے، اپنی ہی زبان میں کہتے ہیں، بہ نسبت مفتوح کی
زبان کے، اس لئے اصحاب برابر اپنی ہی زبان میں خطبے پڑھتے رہے۔

عجمی جو اس وقت اسلام میں داخل ہوئے اہل عرب فاتحین کے تتبع میں عربی
زبان میں خطبہ پڑھنا ان کا فخر تھا، اس طرح عموماً عربی خطبہ تمام عجم میں رائج ہوگیا،
دوسری زبان کا خطبہ شاذ و نادر ہی کوئی دیکھا اور سنا جاتا ہے، جیساکہ شیخ
سعدی شیرازیؒ کا فارسی منظوم خطبہ مشہور ہے اور پورب بنگالہ کی طرف اردو منظوم
جمعہ کا خطبہ پڑھتے ہیں، میں نے متعدد بار سنا ہے۔

دوسری زبان میں خطبہ پڑھنے والوں نے فقہاء کی رخصت سے فائدہ اٹھایا
ہے، یعنی امام محمد، امام ابویوسف اور امام زفر رحمہم اللہ نے اس شرط پر فارسی
زبان میں خطبہ پڑھنے کی اجازت دی ہے کہ عربی عبارت پڑھنے سے "وہ عاجز
ہوں" اور امام اعظمؒ نے بلا شرط، اس کی علت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
اس کے متعلق کوئی حکم نہ فرمایا، تو کسی دوسری زبان میں خطبہ پڑھنا گناہ نہیں ہے
سنت فعلی کے خلاف ہے۔

اگر ایسی صورت نکالی جائے کہ خطبہ کی ضروری چیزوں میں سے وہ جس کو
عوام بھی عربی الفاظ میں پڑھنا پڑھانا دینی بات جانتے ہیں مثلاً ابتدائی کلمات
جو اکثر حدیثیہ خطبوں میں ہیں اور حمد و نعت اور درود و کلمۂ تشہد و قرآن مجید کی
آیات اپنے حال پر عربی میں رہیں، باقی وعظ و پند کے کلمات سننے والوں کیلئے
مناسب حال ان کی زبان میں ہوں تو ایسا خطبہ بھی سنت کہا جاسکتا ہے اسلئے
کہ اس میں خطبات حدیثیہ کے کلمات ضروریہ عربی میں پڑھے جائیں گے اور پند و

نصیحت اور ضروری احکام شریعت سننے والوں کی زبان میں جو ان کے حق میں
مفید ہوں گے، خطبہ کا مقصد یہی ہے، کل خطبوں میں جو مضمون ضروری اور مشترک
ہے، وہ باری تعالیٰ کی حمد ہے اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و تشہد کا
کلمہ اور کم سے کم ایک آیت شریفہ قرآن مجید کی ہے اور پند و نصائح کے بیانات کلام اللہ
سے یا احادیث سے ہوں، خطبات نبویہ کے ہر خطبے میں یہی ہے اور اس قدر عربی میں
پڑھنے سے ادائے سنت ہوجاتی ہے اور خطیب اپنی طرف سے حسب ضرورت
سامعین اور ان کی حالت کے جو کچھ چاہیں کہیں، آخر میں درود حضرت صلی اللہ علیہ وسلم
اور آپ کے آل و اصحاب پر اور دعائے نصرت دین اسلام اور مغفرت مومنین و مسلمین ہو"

خطبہ کے مشترک اور غیر مشترک مضامین کی وضاحت کے بعد مزید ارشاد فرماتے ہیں:

"عربی خطبہ پڑھنے سے خطیب نے ادائے سنت ضرور کرلی لیکن عربی نہ جاننے
والوں کو مفید نہ ہونے کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو غرض خطبہ
فرمانے سے تھی وہ یہاں پوری نہیں ہوتی، حاجت ہے کہ خطبوں کی قدر مشترک
چیزیں تو عربی میں پڑھی جائیں، اس طرح عربی میں خطبہ پڑھنے کی سنت ادا کی
جائے، باقی پند و نصائح و احکام وغیرہ اور خاص خاص مہینوں کے متعلق مضامین
کو خطبہ سننے والوں کی زبان میں پڑھیں، اس نیت سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
سامعین ہی کی زبان میں انھیں احکام بتاتے ہیں، وعظ و پند فرماتے ہیں، میں
بھی سامعین ہی کی زبان میں وعظ و پند کرتا ہوں، دین کے احکام بتاتا ہوں،
اس طرح حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتا ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے خطبہ فرمانے کا مفاد بھی پورا کرتا ہوں، عرب تو آپ ہی کی زبان جانتے تھے،

غیر عرب کے بعض سوال کا جواب اسی کی زبان میں آپ نے دیا، ایمان واسلام کی تعیین بھی اسی کی زبان میں کی ہے، خطبہ کے متعلق امام اعظم اور صاحبین رحمہم اللہ تعالیٰ کا اختلاف اور ان کی دلیلیں جو بالتصریح لکھی گئیں،(1) پورا خطبہ غیر عربی زبان میں پڑھنے کے متعلق ہیں اور فقہا نے اس کو جائز کہہ کر خلافِ سنّتِ متوارثہ ہونے کے سبب سے اس کو مکروہ تنزیہی لکھا ہے لیکن خطبہ میں کلمات مسنونہ اور ماثورہ ضرور پڑھ لینے کے بعد اگر عیدین اور صیام وغیرہم کے احکام اور پند ونصائح بھی عربی میں پڑھے جا چکے ہوں یا نہ پڑھے گئے ہوں، وہ سب عوام کو مطلع کرنے کی غرض سے فارسی یا اردو میں سنا دیے جائیں تو ایسے خطبے پر مکروہ تنزیہی ہونے کا بار بھی نہ ہونا چاہیے، اس لئے کہ خطیب خطبہ کے کلمات مسنونہ کو پڑھ کر ادائے سنت متوارثہ کے فرض سے فارغ ہو چکا ہے۔"

یہ محققانہ موشگافیاں اور علمی نکتہ آفرینیاں داد سے مستغنی ہیں۔

خطاب سے معذرت ملک وملت میں آپ کی سیادت علم وعرفان تو مسلم تھی ہی، پھر بھی حکومت برطانیہ نے آپ کے اثرات کی بنا پر ۱۹۱۵ء میں شمس العلماء کا خطاب پیش کیا، لیکن وہ جس مسند ارشاد پر متمکن تھے، وہ عرفان وتزکیۂ باطن کی مسند تھی، یہاں ذکر وشغل، زہد وورع اور فقر ودرویشی کی قدر تھی، اقلیم باطن کے تاجداروں نے دنیوی اعزاز کو اپنے منصب سے ہمیشہ فروتر تصور کیا ہے اور اس سے نفور وگریزاں رہے ہیں، آپ جس سجادہ پر متمکن تھے اس کی تو خصوصی روایت استغناء وبے نیازی رہی ہے۔

بانیٔ خانقاہ مجیبی حضرت تاج العارفین قدس سرہٗ کے توکل وقناعت کا ذکر کرتے ہوئے صاحب تذکرۃ الکرام نے لکھا ہے کہ نواب قاسم علی خاں صوبیدار نے اپنے عروج وترقی کے

(1) بخوف طوالت درج اقتباس نہیں۔

زمانے میں بعض ارکان دولت کی تحریک اور اپنی عقیدت مندی کی بنا پر یومیہ رقم خرچ خانقاہ کے لئے مقرر کی اور ایک پروانہ ۱۷۵۰ء میں بایں عبارت لکھ بھیجا:

"برائے خیرات وارد وصادر وکفاف ضروریات، پروانہ یومیہ مع مبلغ سی صد روپیہ متضمن براں کہ مبلغ پنج روپیہ یومیہ جہت خانقاہ آں ولی متوکل مقرر کردہ شد۔"

حضرت تاج العارفین نے پروانہ کی پشت پر یہ عبارت لکھ کر پروانہ واپس کر دیا:

"بر در کریمیکہ نشستہ ایم ازلی الآن	میں جس کریم کے در پر بیٹھا ہوا ہوں،
مقرر ومعین مارا بندہ نہ کردہ وکاسۂ رزقِ	اس نے اب تک میرا مقررہ روزینہ بند نہیں کیا
مارا نہ شکستہ کہ بر در دیگر رویم"	ہے اور نہ میرا کاسۂ رزق توڑا ہے کہ میں دوسرے کے در پر جاؤں۔

۱۷۵۱ء میں شاہ عالم بھی حاضر خدمت ہوا اور اس نے خرچ خانقاہ کے لئے جاگیر پیش کرنی چاہی مگر حضرت تاج العارفین نے انکار فرمایا۔

مولانا شاہ بدر الدین کو بھی حکومت کی یہ پیشکش ناگوار گذری اور خطاب، تمغہ وخلعت قبول فرمانے کے بجائے اپنی ناراضگی سے حکومت کو باخبر کرنا چاہتے تھے مگر سر فخر الدین وزیر تعلیمات اور نور الہدیٰ صاحب سابق جج پٹنہ کے پیہم اصرار کی وجہ سے خاموش رہے اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار سب سے کر دیا۔ سر علی امام کو جو اس زمانہ میں سرکاری حلقہ میں بڑی اہمیت رکھتے تھے ایک مفصل خط کے ذریعہ اپنی ناپسندیدگی سے مطلع کر دیا لیکن ان لوگوں نے حالات کی نزاکت کی بنا پر کچھ عرصہ تک آپ کو باضابطہ واپسی سے باز رکھا مگر آپ کے دل میں یہ بات برابر کھٹکتی رہی بالآخر تحریک ترک موالات نے اس کا مناسب موقع فراہم کر دیا اور آپ نے خطاب اور اس کے لوازمات واپس کر دیے۔

امارت شرعیہ آپ کے ارشادات و افادات کا دائرہ صرف علم و فن اور فقر و عرفان ہی تک محدود نہ تھا بلکہ ملک و ملت کی وسیع اور عظیم الشان خدمات کی بنا پر اس عہد کی تمام اہم اور دینی تحریکوں میں آپ کی حیثیت بہت ممتاز نظر آتی ہے، اس سلسلہ میں امارت شرعیہ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

سب سے پہلے ۱۹۲۰ء میں جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس منعقدہ دہلی میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمۃ نے ہندوستان میں اسلامی نظام زندگی قائم کرنے کی طرف علماء کی توجہ مبذول کرائی، اس تجویز نے ملک میں قیام امارت کا ولولہ پیدا کر دیا لیکن کہیں کوئی عملی صورت نہ پیدا ہو سکی، صرف بہار کو اسے جامۂ عمل پہنانے کا شرف حاصل ہوا، جون ۱۹۲۱ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی زیر صدارت علمائے بہار نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بہار و اڑیسہ کا امیر شریعت منتخب کیا، آپ کے اثر سے تحریک امارت نے بہت جلد ایک فعال ادارہ کی شکل اختیار کر لی، مولانا محمد سجاد مرحوم آپ کے نائب اور مشیر کی حیثیت سے برابر شریک کار رہے، امارت کے ذریعہ فتنۂ ارتداد کے استیصال، تبلیغ دین، زکوٰۃ و صدقات کی تنظیم اور قضاء و افتاء کے سلسلہ میں بے نظیر کام ہوا اور بہار میں مستحکم شرعی نظام قائم ہو گیا۔

اس تحریک کی یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ اس کو حضرت شاہ بدرالدین جیسی جامع کمالات ہستی کی امامت اپنے اولین مرحلہ ہی میں حاصل ہو گئی، مولانا مناظر احسن گیلانی فرماتے ہیں:

"امارت کی تنظیم میں مسلمانان بہار کو کامیابی ہوئی اور میرے نزدیک اس کامیابی میں سب سے زیادہ تحسین و تبریک کا مستحق مسلمانان بہار کو ان کے اس فیصلے نے بنا دیا جو انھوں نے امیر کے انتخاب میں اختیار کیا، مسلمانوں کی ذمہ داریوں سے صحیح معنوں میں وہی عہدہ برآ ہو سکتا ہے جس کا دل بھی دماغ کے ساتھ روشن ہو

تنہا دماغ یا صرف دل کی روشنی سے یہ کام انجام نہیں پا سکتا، کی زندگی کے ساتھ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کی تجلیاں جس کے اندر تڑپتی ہوں مسلمانوں کا سچا امیر اور صحیح امام وہی بن سکتا ہے، بہار کی امارت شرعیہ کے امیر اول سیدنا الامام مولانا شاہ بدرالدین قدس سرہ العزیز کی ذات گرامی سمات میں یہی جامعیت پائی جاتی تھی[1]۔"

اس ذاتی عظمت اور ہمہ گیر اثر و رسوخ کے علاوہ آپ نے علمی طور پر بھی امارت کی ضرورت اور نصب امام کے وجوب پر بڑی پُرزور تحریریں لکھی ہیں اور کتاب و سنت کے نصوص اور فقہائے کرام کے اقوال کی روشنی میں اس معاملہ کی اہمیت واضح کی ہے، مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے خطبۂ بنگال میں اس کا اعتراف کیا ہے، انھوں نے فرمایا کہ نصبِ امارت کی ضرورت و اہمیت شک و شبہہ سے بالاتر ہے، اس موضوع پر امارت شرعیۂ بہار نے اہم ترین مواد پیش کر دیا ہے

سیرت کی ممتاز خصوصیات علم و عرفان کی اس جامعیت کے باوجود فخر و ادعاء، کبر و اعجاب، ریا و سمعہ سے بالکل پاک تھے، آپ کی سیرت کی جو ممتاز خصوصیت سب سے زیادہ پرکشش تھی، وہ آپ کی بے نفسی تھی، جس کی شہادت علماء، مشائخ اور خدام کے علاوہ آپ کی تصانیف بھی دیتی ہیں۔

آپ کے عہد کے مشائخ میں بہار شریف کے ایک ممتاز بزرگ نے آپ کی برگزیدگی صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"میں نے اپنی اس عمر میں بڑے بڑے عرفاء کو دیکھا، بڑے بڑے خدا رسیدہ

---

(۱) حیات محی الملۃ والدین ص ۱۔

اور بہت سے صاحب سجادہ اور پیرزادوں کو دیکھا مگر حق یہ ہے کہ ایسا بے نفس بزرگ میری نظر سے تو نہ گذرا ۔"

حقیقت یہ ہے کہ بزم علم ودانش ہو یا حلقۂ عرفاں، آپ ہر جگہ بیحد انکسار اور اخفائے حال سے کام لیتے تھے، خانقاہ مجیبی کی سجادگی سے پہلے آپ کو ایک بار لکھنؤ کے سفر کا اتفاق ہوا، حضرت مولانا فتح محمد تائب صاحب خلاصۃ التفاسیر کے یہاں مہمان ہوئے، ایک دن مولانا شاہ محمد عبدالرزاق قادری فرنگی محلی سے ملنے کے لئے مولانا فتح محمد صاحب اور اپنے دوسرے رفقاء کے ساتھ ان کی خانقاہ میں تشریف لے گئے، کچھ دیر کے بعد اسی مجلس میں شاہ التفات احمد صاحب سجادہ نشین رودولی بھی تشریف لائے، صاحب سلامت کے بعد وہ ایک ممتاز جگہ پر حضرت شاہ عبدالرزاق صاحب کے قریب بیٹھ گئے اور ان سے باتوں میں مشغول ہوئے لیکن اثنائے گفتگو میں باربار ان کی نگاہ آپ کی طرف اٹھتی رہی، آخر انھوں نے آپ سے مخاطب ہوکر مکان پوچھا، آپ نے فرمایا: اطراف پٹنہ، اس مختصر جواب کی وضاحت اور آپ کا مکمل تعارف کرانے کے لئے مولانا فتح محمد صاحب نے کچھ کہنے کا ارادہ کیا، مگر آپ نے اشارہ سے روک دیا، تھوڑی دیر کے بعد شاہ التفات احمد صاحب نے پوچھا کہ اطراف پٹنہ میں ایک جگہ پھلواری شریف ہے، جناب وہاں سے واقف ہیں؟ آپ نے فرمایا: بخوبی! پھر پوچھا: وہاں سے جناب کا کوئی تعلق بھی ہے؟ آپ نے فرمایا: بیعت اور غلامی کا شرف وہیں سے حاصل ہے، جناب کو وہاں کس سے بیعت ہے؟ شاہ التفات صاحب نے دریافت کیا، آپ نے فرمایا کہ میں حضرت مولانا شاہ علی حبیب نصرؔ کا غلام ہوں، پھر انھوں نے خانقاہ کی حالت پوچھی، اس وقت کے صاحب سجادہ کا نام پوچھا، خانقاہ کے مزید حالات دریافت کئے، آپ نے تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی، یہ سن کر شاہ التفات صاحب نے فرمایا: جس تفصیل

کے ساتھ آپ سب کچھ بتا رہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب کو وہاں کی جزئیات تک کی خبر ہے، آپ خاموش ہوگئے، اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے کہا کہ حضرت شاہ علی حبیب قدس سرہ کے خلیفہ اور داماد جناب شاہ بدرالدین صاحب کے خلیفہ خواجہ سید حسن صاحب آروی سے مجھے طریقۂ قادریہ وارثیہ بھی پہونچا ہے، آپ نے محض لاعلمی کے انداز سے فرمایا جی ہاں! پہونچا ہوگا، راستے میں مولانا فتح محمد صاحب نے فرمایا: جناب نے تو وہ کمال کیا جو کسی سے ممکن نہیں، گفتگو کا وہ عنوان اختیار کیا جس سے وہ ذرہ برابر نہ سمجھ سکے کہ جناب خاص پھلواری کے رہنے والے اور خانقاہ کے رکن ہیں اور طرفہ تو یہ کہ آخر میں آپکا نام لے کر تعلق بھی ظاہر کر گئے مگر آپ نے یہ نہ سمجھنے دیا کہ "جناب شاہ بدرالدین" آپ ہی ہیں، میں باربار چاہتا تھا کہ جناب کا تعارف ان سے کرادوں، مگر آپ کے ایماء کی وجہ سے ایسا نہ کرسکا، ورنہ بات تو منھ تک آچکی تھی، آپ نے فرمایا کہ ان کا نہ سمجھنا بہت بہتر ہوا، مجھے اپنے تعارف اور اپنے پیر کی خصوصیات ظاہر کرنے میں ادباً احتیاط منظور ہے، جب آپؒ مولانا فتح محمد صاحبؒ کے مکان پر پہونچ گئے تو شاہ التفات صاحب کو کچھ خیال آیا، اور آپ نے حضرت شاہ عبدالرزاق قادریؒ سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ تھے جو ابھی آپ کے یہاں تشریف لائے تھے؟ شاہ صاحب نے ہنس کر فرمایا: اتنی دیر تک جناب نے گفتگو کی جب بھی نہ پہچانا، یہی بزرگ شاہ بدرالدین صاحب تھے، خاص پھلواری کے رہنے والے اور حضرت مولانا شاہ علی حبیب قدس سرہ کے داماد اور خلیفہ ہیں، شاہ التفات احمد صاحب نے کہا کہ میں تو اتنی دیر سخت مغالطہ میں پڑا رہا، دیر تک ان سے گفتگو ہوتی رہی، پھلواری کے حالات پوچھتا رہا، وہ پوری واقفیت کے ساتھ بیان کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے ان کا نام لے کر اپنے تعلق کو بھی بیان کیا، جب بھی انھوں نے

ظاہر نہ ہونے دیا ' اللہ رے آپ کا انکسار واستتار ' میں تو قائل ہوگیا "۔[1]

بعض ارباب علم وفضل جب علمی استفاضہ کے لئے رجوع ہوتے تو آپ اصلاح ورہبری تو ضرور فرمادیتے مگر اظہار تفوق سے کلیۃً اجتناب فرماتے۔

ترک موالات کی تحریک کے اکثر پہلو مولانا ظفر الدین صاحب رضوی کے نزدیک شرعی حیثیت سے محلِ نظر تھے ' انھوں نے اپنے رسالہ ہادی الہداۃ میں مولانا آزاد اور دیگر علمائے کرام سے اختلافات کا اظہار کیا اور اس رسالہ کا مسودہ آپ کی خدمت میں اصلاح کے لئے بھیجا آپ نے قرآنی آیات کے ترجمہ میں مصنف سے جو تسامح ہوا تھا وہ دور فرمادیا ' اعتراضات کی ساری عمارت از خود منہدم ہوگئی ' لیکن اصلاح میں جو بے نفسی تھی اس کا اظہار آپ کے مکتوب کے ان جملوں سے ہوتا ہے:

" علمی تحریروں میں اصلاح یا کم یا بیش کرنا علماء کا منصب ہے۔ میرا منصب نہیں ' میں اپنی حقیقت سے تمامتر واقف ہوں ' نہ عالم ہوں ' نہ فاضل میں نے ایک خدمت کردی ہے کہ کاتب نے کتابت میں جو غلطی کی ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیت شریفہ سے کہیں سے کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے اور کوئی بڑھ گیا ہے ' پھر آپ کی عبارت میں بھی کہیں پر بعض لفظ اس نے چھوڑ دیا تھا میں نے لکھ کر صحیح کردیا ہے "۔[2]

دربھنگہ کے ایک ذی علم طبیب کے ایک خط کے جواب میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

" مضمون مسئول کی نسبت آپ کی تشفی خاطر کرنے سے پہلے مجھے یہ کہنا ہے کہ میں بڑے بڑے القاب کے لائق نہیں ' میں نہ عالم ہوں نہ فاضل ' نہ

---

(۱) غم پر ملال از نیر پھلواروی (۲) لمعات بدریہ ' ترجمہ کی غلطیوں کی اصلاح اور تفسیر و ترجمہ کے فرق کی وضاحت کے بعد والے اقتباس ہیں۔

درویش کامل ' میں اپنے خالق ومالک کا گنہگار غافل بندہ ہوں ' اگر آیندہ کبھی مجھے یاد فرمائیں تو ان القاب سے معاف فرمائیں "۔

ورع وتقویٰ

آپ کی سیرت کا اہم ترین پہلو اس بے نفسی اور انکسار کے ساتھ وہ کمال ورع وتقویٰ ہے جس نے آپ کی ذات میں تقدس وپاکیزگی پیدا کردی تھی ' اسی لئے آپکے آستانہ پر " ہدیۂ دل وجان " پیش کرنے والوں کا ہجوم رہتا تھا اور علماء ومشائخ سے لے کر عوام تک اپنے دلوں میں شیفتگی اور گرویدگی محسوس کرتے تھے۔

مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے ایک مرتبہ آپ کے منجھلے فرزند مولانا شاہ قمرالدین امیر شریعت ثالث سے پوچھا کہ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کے والد ماجد کی طرف لوگوں کے قلوب کیوں اس قدر کھنچے جاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں نہیں کہہ سکتا ' شاہ صاحب نے فرمایا کہ ان کا اخلاص اور کمال تقویٰ ہے جو سب کو اپنی طرف متوجہ کئے ہوئے ہے۔

حضرت نیر پھلواروی فرماتے ہیں کہ ایک صاحب نے نہایت خوشنما چائے کی پیالیوں کا ایک جوڑہ مجھے دیا کہ میری جانب سے آپ کی خدمت میں نذر کردو ' میں نے نماز مغرب کے بعد خلوت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ فلاں صاحب نے چائے کی یہ پیالیاں خدمت میں نذر کی ہیں ' تو آپ نے فرمایا کہ واپس کردو ' میں نہ لوں گا ' چہرۂ مبارک پر برہمی کے آثار تھے ' میں فی الفور باہر چلا آیا اور میں نے پیالیاں ان کے سامنے رکھ دیں ' انھوں نے پوچھا کہ واپسی کی وجہ کیا ہے؟ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا ' انھوں نے کہا کہ میری طرف سے دوبارہ لیجا کر پیش کرو اور کہو کہ میں پیالی اسی نیت سے لایا تھا ' چونکہ میری کوئی نذر رد نہیں فرمائی گئی ہے ' اس لئے امید ہے کہ یہ بھی قبول کرلی جائے گی ' میں نے کہا ' مجھ میں اب ہمت نہیں ' ان شاء اللہ کل موقع دیکھ کر عرض کروں گا۔ صبح کے وقت خلوت میں حاضر ہوا اور مزاج مبارک خوش پاکر

دریافت کیا کہ رات پیالی کے قبول نہ کرنے کی وجہ معلوم نہ ہوئی، ارشاد ہوا کہ تم کو یاد نہیں کہ دو چار روز ہوئے وہ مجھ سے پانچ روپئے مانگ کر لے گئے ہیں اور تم ہی نے لے جاکر دئے ہیں، ادائے قرض سے پہلے ان کی کسی چیز سے میرے لئے انتفاع جائز نہ ہوگا۔ اگر میں اس کو لے لوں تو میرے لئے سود ہو جائے گا اس لئے ابھی تو میں نہیں لے سکتا۔ کمال تقویٰ یہ تھا کہ آپ مشتبہ چیزوں سے بھی کلیۃً اجتناب واحتراز فرماتے تھے۔

ایک بار خادم نے اپنی لاعلمی سے زکوٰۃ کے پانچ روپئے نذر کے بیس پچیس روپوں میں یکجا کرکے رکھ لئے اور مغرب بعد خلوت میں حاضر ہوکر ان روپوں کو جیب سے نکالا اور پانچ روپئے علیٰحدہ رکھے، آپ نے فرمایا کہ اب اس روپیہ کو علیٰحدہ رکھنے کا کیا فائدہ ہے؟ ان پانچ روپئے سے وہ سارے روپیے مشتبہ ہوگئے، اس کی تعیین کیونکر ہو سکتی ہے کہ زکوٰۃ کے روپے کون تھے اور نذر کے کون؟ سب کو ایک جگہ کردو، اس کو بھی زکوٰۃ ہی کے مد میں رکھ دیتا ہوں، یہ فرماکر آپ نے سارے روپئے زکوٰۃ کی مد میں اٹھاکر رکھ دئے، ان میں کا ایک بھی اپنی ذات پر صرف نہ فرمایا۔

وفات سے ایک ہفتہ پہلے ڈاکٹر ایس پرشاد خلوت میں حاضر ہوئے، دیکھنے کے بعد عرض کیا کہ حضور کو ملیریا ہے اور یہ تپ اسی کی ہے، اگر حکم ہو تو ہومیوپیتھک کی دوا ایک خوراک بناکر حاضر کردوں، آپ نے ارشاد فرمایا: نہ میں ڈاکٹری دوا پیتا ہوں، نہ ہومیوپیتھک، کیونکہ ایک میں الکحل اور دوسری میں اسپرٹ ہوتی ہے اور یہ دونوں ہی میرے نزدیک ناجائز ہیں۔

مرض ہو یا صحت، ہر حال میں خورد ونوش اور استعمال وصرف کی تمام اشیاء میں غایت درجہ احتیاط وتقویٰ سے کام لیتے تھے، وفات سے ایک سال پہلے اپنے آخری ملبوس مبارک

(کفن) کا اہتمام تقویٰ اور طہارت کے معنوی برکات کے ساتھ آپ نے جس طرح فرمایا تھا، وہ آپ کے غایت تورع کا مظہر ہے۔

۱۲۹۵ھ میں آپ کے پیرزادے حضرت شاہ عبدالحق نے جب بیعت کی تو دو روپئے نذر کے طور پر پیش کئے، پھر اپنے نکاح کے موقع پر انھوں نے ایک اشرفی کی نذر گذرانی، یہ نذر پیرزادے کی تھی اور آپ اُن مشائخ میں سے تھے جن کے نزدیک پیرومرشد سے نسبت رکھنے والی ہر چیز قابل اعزاز وتکریم ہوتی ہے، یہ رقم آپ نے اسی وقت اس کام کے لئے مخصوص ومحفوظ کردی، جس کاغذ میں یہ رقم ملفوف تھی اس پر آپ کی یہ تحریر ہے:

"دو روپیہ کہ خاص از جناب حضرت مولوی شاہ محمد عبدالحق صاحب مدظلہ وقت بیعت بہ طور خاص عنایت شدہ بود برائے کفن خود داشتم، محبین ووارثین من بہ ہمیں کار صرف نمایند، ویک اشرفی کہ وقت عقد نکاح خود بہ مقام بہار عنایت نمودہ بودند نیز بہ ہمیں مطلب داشتہ ام کہ بہ تجہیز وتکفین بکار آید۔

راقم محمد بدرالدین قادری"

۱۳۴۱ھ کے ماہ ذیقعدہ میں یازدہم کے بعد جناب مولوی فیض محمد رحمۃ اللہ علیہ کو خلوت میں طلب فرماکر کاغذ کے ایک ٹکڑے میں لپیٹ کر وہ رقم ان کو دی اور تاکید فرمائی کہ یہ دو روپئے ہیں، آپ ان کو علیٰحدہ رکھیں اور دوسرے روپوں میں نہ ملائیں، اسی روپے کی روئی خرید کر سوت بنوائیں، مگر روئی خریدنے کے بعد جو لوگ اس کے بنگولے چنیں، پھر اس کی پونیاں بنائیں، اس کے بعد چرخہ پر سوت کاتیں تو اس طرح کہ یہ تمام کام وضو اور طہارت کے ساتھ ہو اور درود شریف کا ورد بھی جاری رکھیں، اسی طرح بننے والے بھی باوضو ہوں اور تانی وبھرنی میں ہر وقت درود پڑھتے رہیں۔

حق مزدور خدمت آپ جب بھی کسی سے کوئی خدمت لیتے تو اس کے معیار سے زیادہ اس کی اجرت مرحمت فرماتے، پٹنہ کچہری میں ایک صاحب آپ کے متوسلین میں تھے اور وہ دفتری کی خدمت انجام دیا کرتے تھے، بے مرمت کتابوں کی جلد سازی کے لئے آپ انھیں خانقاہ بلانا چاہتے تھے، مگر یہ گوارا نہ تھا کہ ان کا نقصان ہو، جب یہ اطلاع ملی کہ وہ ترک ملازمت کرنا چاہتے ہیں تو آپ نے اپنے خادم خاص سے ارشاد فرمایا کہ وہاں ان کو دس روپے ماہانہ ملتے ہیں، اگر وہ خانقاہ کے نوکر ہو جائیں اور جلد سازی کی خدمت اپنے ذمہ لے لیں تو میں ان کو پندرہ روپے ماہوار تک دے سکتا ہوں۔

حاجت مندوں کی پوشیدہ امداد حاجت مندوں اور سائلوں کا سوال کبھی رد نہ فرماتے، خود تو اسباب معاش سے بے نیاز، خالص متوکلانہ زندگی بسر کرتے تھے مگر آپ کے آستانہ پر سائلوں کا ہجوم ہوتا تھا اور آپ برابر ان کی حاجت روائی فرماتے رہتے تھے۔

آپ کے خوان کرم سے بیشمار یتیموں اور ناداروں کی پرورش ہوتی تھی، اہل قرابت اور غیر اہل قرابت، متوسلین اور غیر متوسلین میں بیشمار غربا اور مساکین ایسے تھے جن کی آپ مالی امداد و اعانت اس طرح فرماتے کہ اعزہ اور خدام خاص میں سے کسی کو علم نہ ہوتا، آپ کی وفات کے بعد آپ کی اس فیاضی کا اعتراف متعدد حضرات نے کیا۔

عسر میں خندہ جبینی عسر و یسر دونوں حالتوں میں آپ کے معمولات، عبادات و ریاضات، مشاغل و اوراد اور خلق ظاہر و باطن میں کبھی کوئی فرق نہیں ہوتا تھا، فیاضانہ وضعداری ہمیشہ قائم رہی، معاشی اعتبار سے ایسے نامساعد حالات بھی پیش آئے کہ خود آپ اور آپ کے خانوادے کے تمام حضرات نے ابالے ہوئے چنے، ہفتہ دو ہفتہ نہیں، عرصہ دراز تک کھائے مگر آپ کی خندہ جبینی اور لینت خلق برقرار رہی اور اگر کوئی مہمان آگیا

تو کسی عنوان سے اس کے حسب حیثیت اس کی مدارات بھی کردی۔

غیبت سے نفرت آپ کبھی کسی کے پس پشت اس کو برا نہ کہتے اور کسی کی جرأت نہ تھی کہ وہ آپ کی مجلس میں کسی کی غیبت کرے، یہ خصوصیت صرف تقریر کی حد تک نہ تھی، تحریر میں بھی آپ اس درجہ محتاط تھے کہ علمی، فکری، ہر طرح کے مسائل میں اپنے اختلافات تو بیباکانہ طور پر ظاہر فرما دیتے مگر کسی کے علم و فضل کی توہین یا اس پر ذاتی حملہ کو گوارا نہیں کرتے تھے۔

تحریک خلافت اور تحریک موالات کا عہد نہایت پرشور و پرآشوب تھا، افکار و آرا کا تصادم رزم و پیکار کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا، اس عہد میں بھی آپ کے مضامین ذاتی مناقشات سے پاک، اعلیٰ درجہ کی متانت کا نمونہ ہوتے تھے، دوسروں کو بھی اسی راہ پر گامزن ہونے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔

صدق و امانت راست گفتاری اور امانت آپ کی طینت میں تھی، آپ کبھی کذب و خیانت کے قریب بھی نہیں گئے، عہد طفولیت سے صادق و امین تھے، مذاق و مزاح میں بھی خلاف واقعہ کہنے کو آپ گناہ تصور فرماتے تھے، آپ کے زمانۂ طفولیت میں کسی نے آپ سے کہا کہ فلاں شخص سے مذاق میں فلاں بات کہہ دو، آپ نے فرمایا: یہ مجھ سے کبھی نہ ہوگا، والد صاحب نے مجھ سے فرمایا ہے کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے۔

آپ کے پیرومرشد شیخ الاسلام حضرت نصر قدس سرہ آپ کی صدق مقالی کی اکثر تعریف فرمایا کرتے تھے، فرماتے کہ جب شرف الدین بھائی کسی بات کے کہنے کو "بدرالدین" کو ہمارے یہاں بھیجتے ہیں اور وہ کہنا شروع کرتے ہیں تو میں ان کے الفاظ پر غور کرتا رہتا ہوں، لفظ بہ لفظ شرف الدین بھائی کے بیان کو میرے سامنے ادا کرتے ہیں اور ایک ذرہ بھر اپنی طرف سے الفاظ کا اضافہ نہیں کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکا شرف الدین بھائی کی زبان اپنے منھ

یں لے کر آتا ہے۔

جب آپ علم و عرفان کے صدر نشین ہوئے تو تقریر کی طرح تحریر میں بھی روایت بالمعنیٰ سے آپ کو احتراز ہوتا اور جب کسی کی بات نقل کرنی ہوتی تو آپ اسی کے الفاظ میں بیان فرماتے، الفاظ میں رد و بدل کو آپ خلاف امانت تصور فرماتے۔

اسرار شریعت و طریقت کی طرح آپ بہت سے لوگوں کے رازوں کے بھی امین تھے، لیکن کبھی کسی کا راز آپ نے کسی پر ظاہر نہ فرمایا۔ اگر کسی نے امانۃً کوئی چیز آپ کے پاس رکھی تو اس کو بجنسہٖ وہی چیز لوٹائی، امانت کے روپوں میں دوسرے روپیے ملانے کو سخت ناپسند فرماتے۔

اپنی وفات سے کچھ پہلے آپ نے مختار وحید صاحب کو طلب فرماکر اپنے امانت داروں کی ایک فہرست مع اشیاء لکھوائی اور چیزوں کی نشاندہی کردی، ارشاد فرمایا کہ جس کی امانت واپس کی جائے اس کے نام کے سامنے نشان دے دیا جائے، جب فہرست مکمل ہوگئی تو آپ نے اپنے دستخط کے بعد اسے محفوظ رکھ لیا، اگر کسی نے آپ سے قرض لیا تو آپ نے واپسی کا تقاضا کبھی نہیں کیا، مصنف "غم پر ملال" لکھتے ہیں کہ ایک بار میں نے کچھ روپئے بہ طور قرض لئے تھے، جب میں واپس کرنے کے لئے حاضر ہوا تو آپ نے روپئے قبول فرمائے، اور زیر لب ارشاد فرمایا: اَوفاكَ اللهُ تعالىٰ كما اوفيتني، پورے الفاظ کی عدم سماعت کی وجہ سے انھوں نے عرض کیا: کچھ حکم ہوتا ہے؟ فرمایا: نہیں! میں نے دعا پڑھی ہے، حدیث میں آیا ہے کہ جب تم سے کوئی کچھ مانگ کر لیجائے تو یہ پڑھو، پھر آپ نے وہ دعائیہ الفاظ دوہرائے۔

علماء و مشائخ سے تعلقات آپ کی ذات میں علم و عرفان کی اعلیٰ خصوصیات جمع ہوگئی

تھیں، اس لئے آپ اپنے عہد میں ارباب فضل و کمال اور اساطین فقر و تصوف دونوں کے مرجع تھے لیکن بایں ہمہ آپ سب کی تکریم کرتے تھے، علمائے کرام خواہ آپکے متوسلین و مسترشدین میں کیوں نہ ہوں، ان کا احترام ملحوظ رکھتے، قدیم بزرگوں کی خانقاہوں کے سجادہ نشین آتے تو آپ تکریماً فرش کے کنارے تک تشریف لاکر ان کا خیر مقدم کرتے، اکثر خانقاہوں اور درگاہوں کے مشائخ آپ کے جامع السلاسل ہونے کی بنا پر آپ سے استفاضہ کرتے، خواجہ حسن نظامی، شاہ التفات احمد رودلوی اور دائرۂ شاہ اجمل الہ آباد کے مشائخ نے آپ سے بعض چیزوں کی اجازت حاصل کی تھی، بہار کی اکثر خانقاہوں کے پیرزادوں اور مشائخ نے بھی آپ سے استفاضہ کیا تھا، آپ کے علمی کمالات اور زہد و تقویٰ کی اعلیٰ صفات کی بنا پر پٹنہ، گیا، آرہ، مونگیر، بہار شریف کے علماء و مدرسین کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے اکابر علم و فضل سب آپ کے گرویدہ تھے، علمائے فرنگی محل میں مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی تعلقات تھے، وہ آپ کے علم و عرفان کے بیحد مداح تھے، مولانا فتح محمد تائب آپ کی ذات ستودہ صفات سے بیحد گرویدگی رکھتے تھے، مفتی کفایت اللہ دہلوی آپ کے تبحر علمی کے ثناخواں تھے، علمائے کرام کی جتنی تعداد آپ کے گرد مجتمع ہوگئی تھی، اس کی مثال بمشکل کہیں اور مل سکے گی، صاحب نزہۃ الخواطر مولانا حکیم عبدالحئی ناظم ندوۃ العلماء نے پھلواری آکر آپ سے ملاقات کی، انھوں نے آپ کے متعلق جن تاثرات کا اظہار کیا ہے ان سے اس عہد کے تمام اکابر علماء کے محسوسات کی ترجمانی ہوتی ہے، فرماتے ہیں:

الشيخ العالم الفقيه الزاهد بدرالدين ابن شرف الدين ابن

شیخ، عالم، فقیہ، زاہد جناب شاہ بدرالدین ابن شرف الدین ابن ہادی ابن احمدی حنفی

الهادي ابن الاحمدي الجعفري الحنفي الپھلواري احد كبار المشائخ رزق قبولاً عظيماً في ولاية بهار وقصده الطالبون لله من انحاء البلاد واشتهر علمه وزهده ونزاهة نفسه وجرأته في قول الحق و حرصه على نفع المسلمين فاختاروه اميرالشريعة في بهار واستقام على ذلك بصدق وعفة ونصيحة للمسلمين حتى لقي الله.

جعفری اپنے عہد کے کبار مشائخ میں سے ہیں، صوبہ بہار میں آپ کو عظیم ترین مقبولیت حاصل ہے، ملک کے اطراف واکناف سے طالبین حق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے ہیں، آپکے علم، زہد، تقدس اور جرأت حق نیز دردمندی ملت کی شہرت ہمہ گیر ہے، بہار کے مسلمانوں نے آپ کو امیر شریعت منتخب کیا تو آپ نے صدق واخلاص کے ساتھ مسلمانوں کی صلاح وفلاح پر استقامت اختیار فرمائی یہاں تک کہ واصل بحق ہوئے۔

لقيته بپھلواري فوجدته شيخاً صدوقاً متودداً حسن الاخلاق حسن السمت والهدى مليح الشمائل شديد التعبد مديم الاشتغال بالكتب يلوح عليه آثار التوفيق والقبول (۱)

میں پھلواری ان کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، میں نے ان کو شیخ کامل، صاحب محبت، کریم الاخلاق، فیاض اور صاحب اتحاف پایا ہے، آپ نہایت حسین وجمیل، سخت ترین عبادت وریاضت کرنے والے، ہمیشہ مطالعہ کتب میں مشغول رہنے والے ایسے بزرگ ہیں جن کی پیشانی پر قبول وتوفیق کے انوار چمکتے ہیں۔

ذوق مطالعہ | آپ کے معمولات میں، ریاضت ومجاہدہ کے ساتھ مطالعہ کتب کو بھی بڑی اہمیت

(۱) نزہۃ الخواطر، الجزء الثامن ص ۸۸

حاصل تھی، نماز عشاء کے بعد معمولات سے فارغ ہوکر آپ کتابوں کے مطالعہ میں منہمک ہوجاتے، اور یہ سلسلہ نصف شب تک جاری رہتا، دوپہر کو بھی گھنٹے دو گھنٹے تک آپ کتابوں کا مطالعہ فرمایا کرتے، اس زمانے کے تمام اخبارات اور اہم علمی رسائل وجرائد آپ کی خدمت میں پابندی سے آتے، اخبارات کے لئے اگر کوئی وقت نہ ملتا تو تناول طعام کے وقت بائیں جانب رکھ کر دونوں معمولات سے بیک وقت فارغ ہوتے، خانقاہ کے کتب خانے کی فنی ترتیب آپکی نگرانی میں آپ کے فرزندان گرامی مولانا شاہ قمرالدین اور مولانا شاہ نظام الدین صاحب مدظلہٗ کی کوششوں کا نتیجہ ہے، ہر کتاب کے اوراق پر آپ کے کچھ نہ کچھ نوٹ ضرور ملتے ہیں۔

ادارہائے طبع وتصنیف کی سرپرستی | اسی خصوصی ذوق مطالعہ کی بناپر ملک کے تمام اہم تصنیفی اداروں سے سرپرستی یا رکنیت کا تعلق تھا، دار المصنفین اور دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کی مطبوعات آپ کی خدمت میں برابر آتیں اور آپ انھیں پسند فرماتے، نئی کتابیں اس کثرت کے ساتھ آتیں کہ ان کی جلد سازی کے لئے ایک دفتری کے باقاعدہ تقرر کی ضرورت محسوس ہوئی۔

علمی کتابوں کے وسیع اور عمیق مطالعہ کے ساتھ ساتھ آپکی بین الاقوامی معلومات کا دائرہ بھی وسیع تھا، دنیا کے تمام اہم واقعات پر نظر رکھتے۔ (باقی)

وفیات

عبدالرزاق قریشی مرحوم

از

جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب، پٹنہ،

ضلع اعظم گڈھ کی ایک چھوٹی سی بستی بسہم میں ۳۰ جولائی ۰۰ء کو عبدالرزاق قریشی پر ۹ بجے دن کو دورہ پڑا، دو تین قے ہوئی، ۱۲ بجکر دس منٹ پر "یا اللہ" کہکر آنکھیں بند کرلیں، اور پانچ منٹ بعد یہ خاموش، متین اور سنجیدہ، سادہ مزاج اسکالر اور ادیب اپنے مالکِ حقیقی سے جاملا انا للہ وانا الیہ راجعون،

عبدالرزاق قریشی کم عمری میں بمبئی چلے گئے تھے، جہاں میری اور اُن کی رفاقت اہم سال یک قائم رہی، اُن کا خاندانی ماحول کچھ ایسا حوصلہ افزا نہ تھا، کہ وہ کسی اسکول یا مدرسے کی تعلیم مکمل کر سکتے، اس کے باوجود وہ بمبئی آئے تو اپنے ساتھ پڑھنے لکھنے کا شوق بھی لیتے آئے تشنگی علم انھیں مختلف چشموں تک لے گئی، مگر آخر میں میکدۂ شبلی کے اس بادہ خوار کو جس ساقی کی تلاش تھی، وہ ۱۹۳۲ء میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم کی صورت میں نظر آگیا، جو دارالمصنفین چھوڑنے کے بعد پہلے گورنمنٹ کالج احمد آباد پھر وہاں سے بمبئی کے ایک سرکاری کالج میں اردو کے پروفیسر ہوکر آگئے تھے، اعظم گڈھ کے ہونے کے ناتے اور دبستانِ شبلی کے خوشہ چیں کی حیثیت سے قریشی صاحب نے ندوی صاحب سے اپنا تعارف کرایا، طالب و مطلوب کی یہ ملاقات

استاد اور شاگرد، بزرگ و عزیز، دوست اور رفیق کی حیثیتوں میں تبدیل ہوکر زمانے کے بدلتے ہوئے لیل و نہار کے باوجود پوری وضعداری کے ساتھ ۱۹۳۲ء سے پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب مرحوم کی زندگی کے آخری لمحوں تک برقرار رہی۔

عبدالرزاق قریشی نے ابتدا میں تفریحاً بمبئی کی اردو صحافت کی دنیا میں بھی دشت نوردی کی، پھر ایک مشن اسکول میں، اس کے بعد پارسی اسکول میں ٹیچر ہوکر پڑھاتے رہے، کچھ عرصہ ایک گجراتی اسکول میں بھی پڑھایا، پھر انجمن اسلام ہائی اسکول (بمبئی) میں بھی اُردو اور فارسی کے مدرس ہوئے، جہاں انھوں نے طلبہ کو صرف اعلیٰ نمبری کے لئے نہیں تیار کیا، بلکہ ان میں سے بیشتر طالب علموں میں زبان کا ستھرا ذوق بھی پیدا کیا، جتنے شوق سے وہ لڑکوں کو پڑھاتے تھے، اتنی ہی دلچسپی کے ساتھ وہ اُن کے ذاتی مسائل کے حل کرنے میں بھی لگے رہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اُن کے شاگرد اُن کا نام بڑے احترام و عقیدت سے لیتے رہے، درس و تدریس کے علاوہ طلبہ میں تحریر و تقریر کا شوق پیدا کرتے، اور مختلف سرگرمیوں کے ذریعے ان کی تنظیمی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا کام بھی وہ بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیتے تھے، مگر جیسے جیسے ان کا علمی معیار بلند ہوتا گیا انھیں ہائی اسکول کا تدریسی میدان اپنے لئے تنگ نظر آنے لگا۔ ۱۹۴۷ء میں انجمن اسلام کے تحت ایک اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا، ۱۹۵۵ء سے پروفیسر نجیب اشرف ندوی (کالج سے ریٹائر ہوکر) اس ادارے کے پورے وقت کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے، اس درمیان میں انسٹی ٹیوٹ سے عبدالرزاق قریشی کا تعلق گہرا ہوتا گیا اور وہ محسوس کرنے لگے کہ ان کا میدانِ عمل انسٹی ٹیوٹ ہی ہوسکتا ہے مگر دوسری طرف اسکول کے ہیڈ ماسٹر خلیفہ ضیاء الدین صاحب ان کے ایسے قدرشناس تھے کہ ان کو اسکول سے جدا کرنا گوارا نہ تھا، جب معاملہ میرے سپرد ہوا تو ایک روز میں نے خلیفہ صاحب سے کہا: "دیکھئے

قریشی صاحب سے ہم اور آپ دونوں خصوصی تعلقات رکھتے ہیں مگر ان کا ایک اہم کام آج تک نہ کرپائے، یعنی ان کی شادی نہ کرا سکے۔ اس طرح تو وہ دنیا سے لاولد ہی رخصت ہو جائیں گے۔ اب میں ان کی شادی کی تجویز لے کر آیا ہوں وہ حیرت سے میرا منہ تکتے رہے۔ پھر بولے: "تمہید چھوڑئے، تجویز بیان کیجئے" میں نے کہا: "عبد الرزاق قریشی کا رشتہ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے منسلک کر دیا جائے، جہاں سے ان کی تصنیفات معنوی اولاد کی صورت میں ظہور میں آسکیں" ایک لمحے توقف کے بعد وہ متبسم ہوئے اور بولے: "رشتہ منظور"۔ اور ۱۹۶۳ء سے عبد الرزاق قریشی نے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو اپنا شریک حیات بنا لیا، اور آخری دم تک اس رشتے کو اس طرح نبھایا کہ انتہائی معذوری کے سوا ایک دن ایسا نہیں گذرا جب کہ وہ بمبئی میں موجود ہوں اور یہاں حاضر نہ رہے ہوں۔ وہ یہاں اسکول ہی کی تنخواہ پر آئے لیکن شادمانی اور انبساط کا یہ عالم تھا کہ جیسے انھیں یونیورسٹی پروفیسر کا گریڈ مل گیا ہو؛ جب تک رہے اسی نشہ میں سرشار رہے۔

ایک بار وہ چھٹی لے کر وطن گئے اور وہاں علالت کی وجہ سے قیام میعاد سے زیادہ طویل ہو گیا۔ وہ تنخواہ پیشگی لے گئے تھے۔ واپس ہوئے تو خود ہی حساب لگا کر معلوم کیا کہ جتنی چھٹی ان کی جمع تھی اس سے دو چار دن زائد ہو گئے تھے۔ اکاؤنٹ آفس نے کوئی پرسش نہیں کی۔ کسی نے یہ بھی مشورہ دیا کہ یہ چند دن اگلی چھٹی میں منہا کر دئے جائیں مگر انھیں اطمینان نہیں ہوا۔ میں انجمن اسلام کا جنرل سکریٹری تھا۔ انسٹی ٹیوٹ کے انتظامی امور سے بھی میرا تعلق تھا۔ انھوں نے مجھے صورت حال سمجھائی اور زائد دنوں کی تنخواہ واپس کرنے پر اصرار کیا۔ بڑی مشکل سے میں انھیں اس پر راضی کر سکا کہ وہ ان کو

نصف تنخواہ کی چھٹی میں منہا کرا دیں جو ان کے حساب میں جمع تھی۔

استغنا کی ایک شان یہ بھی تھی کہ ذاتی ادب اور تحقیق و تالیف کے سلسلہ میں انھیں مختلف ادیبوں اور اسکالروں سے کافی خط و کتابت کرنی پڑتی تھی۔ ایک روز میں نے انھیں ڈاکخانے کے عام قسم کے کارڈ اور ان لینڈ کاغذ پر خطوط لکھتے دیکھا تو کہا "آپ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی اسٹیشنری اور ٹکٹ کیوں نہیں استعمال کرتے؟" ہنس کر فرمانے لگے: "بھائی! میں اپنی طرف سے انسٹی ٹیوٹ کی یہی چھوٹی سی خدمت تو کرتا ہوں"۔

اکتساب علم میں عبد الرزاق قریشی نے جتنی محنت، شوق اور تلاش سے کام لیا وہ اپنی جگہ خود ایک مثال ہے۔ وہ ہر اتوار کو نجیب اشرف صاحب ندوی مرحوم کے بنگلہ جوگیشوری پہونچ جاتے۔ ان کے ذاتی کتب خانہ میں اردو، فارسی اور انگریزی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ یہ کتابیں اور ندوی صاحب کی ہدایتیں ہر اتوار کو قریشی صاحب کو وہاں کھینچ لے جاتیں۔ اس معمول پر وہ اس پابندی سے عمل کرتے کہ بمبئی کی بے تحاشہ بارش اور تیز و تند ہوائیں بھی انھیں اس گیارہ میل کے سفر سے کبھی باز نہ رکھ سکیں، صبح سے شام تک وہ مطالعے میں غرق رہتے۔ یہ سلسلہ سالہا سال تک جاری رہا، اور اس وقت ختم ہوا جب ان کی صحت بہت خراب ہو گئی اور وہ اتنی لمبی مسافت طے کرنے کے لائق نہیں رہے۔

وہ اپنا ہر کام بڑی لگن کے ساتھ کرتے اور علمی کاموں میں خوب سے خوب تر کے قائل تھے۔ ان کی سیدھی سادہ زندگی دیکھ کر یہ اندازہ لگانا دشوار ہوتا کہ وہ اپنے مسودے اتنے سلیقے، احتیاط اور اتنی نفاست کے ساتھ تیار کرتے ہوں گے۔ ان کا خط بڑا پاکیزہ اور پختہ تھا۔ تحقیقی کاموں میں وہ دوسرے درجہ کی چیز گوارا نہیں کر سکتے تھے،

انھوں نے کسی کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم نہیں پائی لیکن مغربی طریقۂ تحقیق کا نہایت گہرا مطالعہ کر کے اس پر عمل پیرا تھے۔ ان کی مختصر سی کتاب "مبادیات تحقیق" ریسرچ کرنے والوں کے لئے نہایت مفید ہدایت نامہ ہے اور اردو زبان میں اپنے طرز کی شاید پہلی کتاب۔

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں عبدالرزاق قریشی ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اپنے خاص موضوعات پر تحقیق کرنے کے علاوہ ادارے کے سہ ماہی رسالہ "نوائے ادب" کی ادارت بھی سنبھالی اور رسالے کو جس بلند معیار اور وقار کے ساتھ ایڈٹ کیا، اس نے ساری اردو دنیا سے خراج تحسین حاصل کی۔ جب ان کی وفات کی خبر ملی تو مجھے اور باتوں کے ساتھ نوائے ادب کی یاد آئی اور بے اختیار غالب کا شعر زبان پر آگیا ؂

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

عبدالرزاق قریشی نے بڑی تعداد میں ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین لکھے۔ تعلیم بالغان کے سلسلہ میں بمبئی کی مشہور سوشل ورکر مسز کلثوم سایانی نے ۱۹۴۰ء میں ایک پندرہ روزہ اخبار "رہبر" نکالا تو کئی مہینوں تک اس کے سارے مضامین عبدالرزاق قریشی اور راقم الحروف نے مل کر لکھے۔ ان مضامین میں بڑی عمر کے لوگوں کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے سہل نگاری کا لحاظ بہت ضروری تھا۔ اخبار، زبان اور مضامین دونوں حیثیتوں سے اس قدر مقبول ہوا کہ تھوڑے دنوں میں بہ یک وقت یہی اخبار اردو (ٹائپ)، دیوناگری اور گجراتی تینوں رسم خط میں چھپنے لگا۔ اس کوشش کو ملک کے مشہور سربراہوں نے بہت سراہا۔

قریشی صاحب کے سترہ شائع شدہ مضامین کا مجموعہ "تاثرات" کے عنوان سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا جس میں بعض کتابوں اور شخصیتوں کے متعلق ان کے تاثرات ہیں۔ مضامین میں ان کی انشا پردازی شبلی اسکول سے وابستگی ظاہر کرتی ہے اور کتاب کا معارف پریس میں طبع کرانا ان کی دارالمصنفین کے دلدادہ ہونے کی دلیل ہے۔

مہاراشٹر کی ریاست میں (جو پہلے ریاست بمبئی کہلاتی تھی) اردو کی تعلیم میں خاصی سہولتیں فراہم تھیں پھر بھی بعض چیزیں خود اردو والوں کے کرنے کی تھیں جب تک حکومت نے درسی کتابیں بخش تومیانے کا فیصلہ نہیں کیا تھا، ایسی کتابوں کی تالیف واشاعت کا مسئلہ اردو والوں کے لئے منفعت نہ ہونے کی وجہ سے قابل توجہ نہ سمجھا جاتا تھا۔ اوپر کی جماعتوں کی زبان دانی کی مناسب کتابیں مفقود تھیں۔ انجمن اسلام نے صورت حال کا جائزہ لے کر تالیف کا کام عبدالرزاق قریشی کے سپرد کیا، اور ان کی مرتب کی ہوئی، ریڈریں "نگار اردو" کئی سال تک داخل نصاب رہیں اور اس طرح ہزاروں اردو داں طلبہ کی اہم ضرورت پوری ہوتی رہی۔

مئی ۱۹۵۶ء میں حیدرآباد اردو کانفرنس کی ایک نشست میں "اردو اور تحریک آزادی" موضوع بحث تھا۔ اسی نشست میں یہ خیال پیش ہوا کہ اگلے سال جب پہلی جنگ آزادی کی صدسالہ سالگرہ منائی جائے تو اردو کی ایسی تحریروں اور نظموں کا جن سے ملک کی آزادی کی تحریکوں کو بڑی تقویت پہونچی ایک انتخاب انجمن ترقی اردو (ہند) کی طرف سے شائع ہو۔ انجمن اسلام کے صدر سیف طیب جی بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے انجمن اسلام کی جانب سے انتخاب کے شائع کرنے کے اخراجات کی ذمہ داری قبول کرلی۔ مگر بعض اسباب کی بنا پر انجمن ترقی اردو اس انتخاب کی ذمہ داری لینے پر رضامند نہ ہوئی اور انجمن اسلام نے یہ کام عبدالرزاق قریشی کے سپرد کردیا جو اس وقت تک انجمن کے لائف ممبر بن چکے تھے۔ اگلے سال مئی میں چارسو صفحات کا

یہ انتخاب قریشی صاحب کے مقدمہ کے ساتھ "نوائے آزادی" کے نام سے ٹائپ میں چھپ کر شائع ہوا تو لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں، اس کا پہلا نسخہ انجمن کے صدر نے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی خدمت میں پیش کیا۔ یوں تو اس موقع پر جنگ آزادی اور تحریک آزادی کی تاریخیں ہندوستان کی ہر زبان میں لکھی گئیں لیکن اردو کے سوا کسی زبان کو یہ فخر نصیب نہیں ہوا کہ وہ کوئی ایسا مجموعہ (نثر و نظم کا) پیش کرتی جس سے ثابت ہوتا کہ وہ اس ملک کی تحریک آزادی میں معاون ہوئی ہو، یہ کتاب انجمن کے شعبۂ اشاعت (ادبی پبلشرز) کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں سب سے پہلے قریشی صاحب نے مرزا مظہر جان جاناں اور انکے اردو کلام کو تحقیق کا موضوع بنایا، جب یہ کتاب کی صورت میں ان کے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی تو اردو کے ایک بڑے بلند پایہ محقق اور نقاد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ کتاب ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کی تھیسس کی حیثیت سے پیش کر دی جاتی تو پی ایچ ڈی کی ڈگری مل جاتی۔

انسٹی ٹیوٹ کے تحقیقی پروگرام کے تحت انھوں نے بڑی قابلیت کے ساتھ "دیوانِ عزلت" اور "بارہ ماسہ" دو نایاب قلمی نسخے ایڈٹ کر کے شائع کرائے، پھر "اردو کا تمدنی سرمایہ" کے عنوان سے نوائے ادب میں ان کے کئی مضامین شائع ہوئے، موخر الذکر کام میں ان کی دلچسپی اتنی بڑھی اور اتنا مواد جمع کیا کہ ایک مستقل تصنیف کا مسودہ تیار ہو گیا جو اب دار المصنفین کے اشاعتی پروگرام میں شامل ہے۔

"مبادیات تحقیق" کا ذکر اوپر آچکا ہے، قریشی صاحب کا تعلق اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے قائم ہوا تو پوسٹ گریجویٹ کلاس کے طلبہ اور تحقیق کام کرنے والوں کی خاصی تعداد ان کے ارد گرد منڈلانے لگی، وہ لوگ ان سے مشورے کرتے، مقالے دکھاتے، مشکل مقامات کے حل طلب کرتے، عبدالرزاق قریشی

رنجاں مرنج طبیعت کے آدمی، بڑی خوش دلی کے ساتھ ان کی مدد کے لئے ہر وقت تیار رہتے۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے محسوس کیا کہ بیشتر طلبہ تحقیق کے ابتدائی اصول اور طریقۂ کار سے بے خبر ہوتے ہیں کالج اور یونیورسٹی والے اس مفروضے کے تحت کہ طلبہ یہ باتیں خود ہی معلوم کر لیں گے، انھیں اس کی معلومات دینا غیر ضروری سمجھتے ہیں، چنانچہ اکثر مقالے اس طرح لکھے اور پیش کئے جاتے ہیں کہ جن کو پڑھنے میں الجھن ہوتی ہے، قریشی صاحب نے مبادیات تحقیق میں وہ اصول بتائے ہیں جن سے مقالہ کی تیاری میں باضابطگی پیدا ہوتی ہے۔

کردار کے اعتبار سے عبدالرزاق قریشی بڑے بلند مرتبے کے انسان تھے، وضعداری پسند کرتے اور اسے نباہنا بھی خوب جانتے تھے، ان کے عزیز اور رشتہ دار وطن سے علاج کے لئے بمبئی آتے تو یہ ان کے مشیر اور مددگار ہوتے، مرض کے لحاظ سے کسی ماہر طبیب کا انتخاب، اس سے وقت طے کرنا، پھر بیمار کو وہاں تک لے جانا، ضرورت ہوئی تو اسپتال یا نرسنگ ہوم میں داخل کرانا اور اس وقت تک اس کا حال چال دریافت کرتے رہنا جب تک کہ اس کا قیام بمبئی میں رہتا ہے، یہ سب ان کی زندگی کے معمول میں داخل تھا، یہی سلوک وہ اکثر ان طالب علموں کے ساتھ بھی کرتے جن کے بارے میں انھیں شبہہ ہو جاتا کہ وہ بغیر والی یا مددگار کے ہیں۔

عبدالرزاق قریشی راسخ العقیدہ تو ضرور تھے مگر مذہبی فرائض کی ادائگی میں ان سے شروع میں کوتاہی ہوتی رہی، میں جب بھی ان سے کہتا: "حضرت! آپ پر صوم و صلوٰۃ کا حکم کب نازل ہوگا؟" تو وہ بڑے معصوم انداز میں مسکرا دیتے اور بس! پھر ایک وقت وہ آیا جب وہ عبادت کی طرف رجوع ہوئے اور اس جوش و خشوع کے ساتھ عبادت میں مشغول دکھائی دینے لگے کہ ان کے وہ احباب بھی جو بہت پہلے سے پابند صوم و صلوٰۃ تھے ان کی عبادت پر رشک کرنے لگے، ان کے قلب کی اس تبدیلی کا راز افشا کرنا شاید اخلاقی جرم ہو، پھر بھی ان کی روح سے معذرت کرتے ہوئے

بیان کردینے کو جی چاہتا ہے، خود ان کا کہنا تھا کہ ایک روز وہ اپنے کمرے میں تنہا سو رہے تھے فجر ہونے والی تھی، اب دھندلکا تھا کہ انھیں محسوس ہوا کہ اذان کی آواز آرہی ہے اس سے پہلے ایسی آواز کبھی سنائی نہ دی تھی، ان کی آنکھ کھل گئی مگر وہ پلنگ پر لیٹے رہے، دوسرے دن پھر یہی ہوا، اس مرتبہ اذان کی آواز اور قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوئی، پھر آنکھ کھلی اور یہ لیٹے رہے تیسرے دن اور چوتھے دن بھی یہی بات ہوئی، ہر روز آواز قریب تر ہوتی گئی، پھر ایک صبح ایسی آئی جب کہ انھیں لگا جیسے اذان ان کے کانوں میں دی جا رہی ہو — اور یہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے، کچھ دیر تک غور کرتے رہے، پھر اٹھے، وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کرنے بیٹھ گئے، اس دن سے ان کی نماز شروع ہوئی جس کی پابندی آخری دم تک قائم رہی، امسال وہ فریضۂ حج ادا کرنے کا عزم کر چکے تھے مگر وقت آگیا اور وہ سوئے عدم سفر پر چلے گئے۔

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے ریٹائر ہو کر ان کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ دار المصنفین میں رفیق بن کر کام کریں، اس کی پوری تیاری انھوں نے کر لی تھی، ذاتی کتب خانے کی کثیر کتابیں انھوں نے وہاں بھجوا دی تھیں اور اربابِ دار المصنفین بڑے شوق کے ساتھ ان کے چشم براہ تھے، مگر

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

عبدالرزاق قریشی کی پوری زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے ان کی زبان سے میر کا یہ شعر کتنا مناسب معلوم ہوتا ہے ؎

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ سے آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب، صاحب نظر بنے ہے

اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

ادبیات

غزل

از جناب عروج زیدی صاحب، رام پور،

آسودگیٔ قلب و نظر کون لے گیا؟ ہم سے ہماری شام و سحر کون لے گیا؟
موتی جڑے ہوئے تھے چمن میں روش روش وہ دولت نگار سحر کون لے گیا؟
آشوب جاں بھی ہم کو ملاقات اولیں ان کے حضور بار دگر کون لے گیا؟
آنکھوں کے میکدے میں اداسی کی ہے نمود ان کی نظر سے کیف نظر کون لے گیا؟
کیا پاسبان عقل کو بھی کچھ پتا نہیں رنگینیٔ حیات بشر کون لے گیا؟
اب تو غم فراق بھی ہے قابل قبول دل سے یقین جذب اثر کون لے گیا؟
ہلچل مچی ہوئی ہے حریم جمال میں ان کے حضور دل کی خبر کون لے گیا؟
وہ کیا گئے کہ اپنی تو دنیا بدل گئی کیا کہیے حسن شام و سحر کون لے گیا؟
اے چشم شوق تو یہ کہاں تھم کے رہ گئی توفیق احتیاط نظر کون لے گیا؟
بے تابیاں اگر مری تقدیر میں نہ تھیں وہ جس طرف تھے مجھ کو ادھر کون لے گیا؟
چونکا ہوں خواب سے تو یہ مصرع ہے بر زباں سرمایۂ نشاط نظر کون لے گیا؟
کسب کمال پر یہ بتا وضع انکسار! دل سے مجال عرض ہنر کون لے گیا؟
دامان ناز پر ہے نہ پلکوں پہ اے عروج میری متاع دیدۂ تر کون لے گیا؟

مطبوعات جدیدہ

عورت اور اسلامی تعلیم ۔ از جناب الک رام صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۶، مجلد قیمت ۵ روپیہ، ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

اس کتاب میں عورتوں کی مختلف حیثیتوں یعنی بیٹی، بیوی، ماں، مطلقہ، بیوہ اور وارثہ کا ذکر کرکے ان کے بارے میں اسلامی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، اس سلسلہ میں زوجین کے باہمی حقوق، نکاح و طلاق اور وراثت کے متعدد جزئی فقہی احکام کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اسلامی مسائل میں مصنف کے ذہن کی بے تعصبی و سلامت روی اور قلم کا اعتدال و توازن مشہور ہے، مجموعی حیثیت سے اس کتاب کا بھی نقطۂ نظر صحیح ہے، لیکن زانی کو مومن تسلیم نہ کرنا اور الزانی لاینکح الا زانیۃ او مشرکۃ "الخ کی روسے یہ خیال کرنا کہ وہ مسلمان عورتوں سے شادی نہیں کرسکتا، نیز شادی شدہ زناکاروں کے لئے رجم کی سزا کا انکار (ص ۶۶ تا ۷۱) یہ سب جمہور کے مسلک کے خلاف ہے، رجم کا حکم قرآن مجید سے چاہے نہ ثابت ہو لیکن صحیح حدیثوں اور خلفائے راشدینؓ کے تعامل سے ثابت ہے، قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمہ میں روانی اور مطلب خیزی کے خیال سے الفاظ کی سرے سے رعایت نہ کرنا، چاہے قاری کو بظاہر اچھا معلوم ہو لیکن احتیاط کے منافی ہے، جیسے سیصلون سعیراً میں صیغہ معروف تھا لیکن ترجمہ صیغہ مجہول سے یہ کیا گیا ہے "وہ دوزخ کی آگ میں جھونکے ہی جائیں گے" (ص ۵۱) اسی طرح ولا تاکلوہا کا ترجمہ "ضائع نہ کرو" (ص ۵۲) قد انزل علیکم لباسا یواری سواٰتکم میں انزلنا کا "دیا" اور

سواٰت کا عیب (ص ۱۲۴ - ۱۲۵) اور فان اللہ غفور رحیم کا ترجمہ "اللہ رحمت سے بخشنے والا" (ص ۱۲۵) کیا گیا ہے، وقل رب ارحمھما کما ربیانی صغیراً میں ربیانی کا یہ ترجمہ تو بالکل ہی غلط ہوگیا ہے "اور دعا کر کہ اے میرے رب جیسے تو نے میرے بچپن میں پرورش کی تھی اسی طرح اب دونوں پر رحم فرما" (ص ۱۴۲) ص ۱۲۸ پر حضرت عمرؓ کا یہ فرمان درج ہے "کوئی شخص چھ ماہ سے زیادہ فوج کے ساتھ باہر نہ رہے" مگر حوالہ نہیں دیا گیا ہے، مولانا شبلیؒ نے بھی الفاروق حصہ دوم میں اس کو بلا حوالہ ہی نقل کیا ہے لیکن چار ماہ لکھا ہے۔ کتابت و طباعت کی متعدد غلطیوں سے قطع نظر کہیں کہیں لغزش قلم بھی ہوگئی ہے، جیسے "اگر گھر میں کوئی نہ ہو تو ان میں داخل نہ ہو" (ص ۳۶) اللہ کی صفات رحمت و غفر (ص ۱۲۵ - ۱۲۶) اردو میں غفران اور مغفرت مستعمل ہیں لیکن غفر کا استعمال عام نہیں، اس کتاب کا پہلا اڈیشن بہت پہلے شائع ہوا تھا، اس زمانہ میں اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا تھا، اب گو متعدد کتابیں چھپ گئی ہیں تاہم یہ بہت مفید اور سیر حاصل ہے، لائق مصنف نے نظر ثانی میں بہت کچھ ترمیم و اضافہ بھی کیا ہے۔

تذکرہ علمائے اعظم گڈھ ۔ مرتبہ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۳۵۰، قیمت ۱۲/۵ پتے (۱) جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس، (۲) مکتبہ نعمانیہ، دیوبند۔

اعظم گڈھ کا ضلع مردم خیزی میں ہمیشہ سے ممتاز چلا آرہا ہے، اسکی خاک سے بڑے بڑے اصحاب علم و کمال پیدا ہوئے لیکن ابھی تک انکے حالات میں کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی تھی، اس لئے یہاں کے ایک لائق اہل قلم مولوی حبیب الرحمٰن قاسمی نے نویں صدی سے ابتک کے وفات پالے والے تقریباً پونے دو سو علما و فضلا کے مختصر حالات

وکمالات زیر نظر کتاب میں لکھے ہیں، مصنف کے انتخاب میں وہی اہل علم آسکے ہیں، جو علمی و دینی حیثیت سے ممتاز تھے، یعنی مدرسین مصنفین اور اصحاب سلوک و معرفت وغیرہ، یہ کام بڑا محنت طلب تھا، لیکن مصنف نے اس کو انجام دے کر ایک مفید علمی خدمت کی ہے، ان کو تحریر و تصنیف کا اچھا ذوق ہے، لیکن ابھی جوان ہیں؛ اور یہ ان کی پہلی کتاب ہے، اس لئے زبان و بیان کی معمولی خامیوں اور بعض واقعاتی غلطیوں کے علاوہ جوش و جذبہ اعتدال پر اور جماعتی عصبیت غیر جانبداری پر غالب آگئی ہے، اس لئے دوسرے طبقہ و مسلک کے اہل علم کے ذکر میں فراخدلی اور غیر جانبداری سے کام نہیں لیا ہے، انھوں نے جماعت اسلامی کے ذکر میں جو لب و لہجہ اختیار کیا ہے، وہ نامناسب اور متانت تحریر کے خلاف ہے، متن میں معروف اشخاص پر تو حواشی تحریر کئے گئے ہیں، لیکن غیر معروف لوگوں پر نوٹ نہیں لکھا گیا ہے،

جدید عربی شاعری۔ از جناب نسیمہ فاروقی صاحبہ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۰۸، مجلد مع گرد پوش قیمت ۸ے روپے :- انجمن ترقی اردو ہاؤز ایونیو، نئی دہلی۔ (۲) مکتبہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ، (۳) شب خون کتاب گھر ۳۱۳ رانی منڈی، الہ آباد۔

عربوں کی حکمرانی اور سیاسی اقتدار کا خاتمہ ہوا تو ان کے علوم و فنون کی ترقی رک گئی، لیکن نپولین کے مصر پر حملہ کے بعد ان میں یک گونہ بیداری پیدا ہوئی جس کے نتیجہ میں ان کی شاعری نے نئی کروٹ لی اور اس میں عصری میلانات اور قوم پروری و حب الوطنی کے جذبات کی ترجمانی ہونے لگی، اردو میں اس دور کی عربی شاعری کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے، اس کتاب میں

جدید عربی شاعری کا جائزہ لے کر اس کی اہم خصوصیات دکھائی گئی ہیں اور ہر دور کے بعض ممتاز شعراء کا تعارف کرایا گیا ہے، اس سے عربوں کی بعض ادبی، تعلیمی، قومی اور سیاسی تحریکوں کے بارہ میں بھی واقفیت ہوتی ہے، شروع میں نپولین کے مصر پر حملہ اور قدیم عربی شاعری اور آخر میں شعرائے مہجر (عرب ملکوں سے جاکر یورپ و امریکہ میں آباد ہونے والے عربی شاعروں) کا بھی مختصر ذکر ہے، یہ لائق مصنفہ کی پہلی کتاب ہے اور بہت عجلت میں لکھی گئی ہے، لیکن بایں ہمہ طلبہ اور عام ناظرین کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

صحیفہ :- مرتبہ جناب ابو البیان حماد عمری صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۴۶۰، قیمت تحریر نہیں، پتہ :- جمعیۃ ابنائے قدیم جامعہ دار السلام، عمر آباد، ضلع شمالی ارکاٹ، تمل ناڈو۔

جامعہ دار السلام عمر آباد جنوبی ہند کی قدیم اور مشہور دینی درسگاہ ہے، اس سال اپریل میں اس کا جشن طلائی بہت دھوم دھام سے منایا گیا تھا جس میں ہندوستان کے ہر طبقہ و مسلک کے اصحاب علم کے علاوہ متعدد عرب ملکوں کے مندوبین بھی شریک ہوئے تھے، اس موقع پر جامعہ کے طلبائے قدیم کی جانب سے یہ یادگار مجلہ شائع کیا گیا ہے جو متنوع مضامین پر مشتمل ہے، مذہبی، علمی، تعلیمی اور سوانحی مضامین کے علاوہ ایک حصہ میں جامعہ کے مقاصد اور اس کے فضلا کی خدمات سے متعلق مضامین درج ہیں اور آخر میں اس کے بانی اور اس سے وابستہ اہم اشخاص کے حالات تحریر کئے گئے ہیں، یہ نمبر سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے، مضامین اوسط درجے کے ہیں اس لئے ہر مذاق و استعداد کے لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، دار المصنفین اور جامعہ کا تعلق بہت قدیم ہے، حضرت سید صاحبؒ وہاں تقسیم اسناد کا خطبہ دے چکے ہیں، اگر اس نمبر میں وہ خطبہ اور جامعہ سے سید صاحب کے تعلق کا ذکر بھی آجاتا تو اچھا تھا۔

تاریخ میلاد۔ مرتبہ مولوی حافظ حکیم عبد الشکور مرزا پوری مرحوم، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت صہ، پتہ: الفرقان بکڈپو، ۳۱ نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ۔

گذشتہ سو سال سے مسلمانوں کے درمیان جو مسائل سخت اختلاف و انتشار کا باعث بنے ہوئے ہیں ان میں ایک میلاد کا مسئلہ بھی ہے، اس کتاب میں اس کا جائزہ لے کر دکھایا گیا ہے کہ مروجہ میلاد کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی، اس پر پہلے کون سی کتاب لکھی گئی، اس کے مصنف نیز میلاد کے بانی اور اس کو فروغ دینے والے کی علمی و دینی حیثیت کیا تھی، پھر رفتہ رفتہ میلاد میں کیا اضافہ ہوتا رہا، مصنف کے خیال میں نفس ذکر ولادت اور مروجہ مجلس میلاد میں بڑا فرق ہے، وہ اول الذکر کو بالاتفاق جائز اور موخر الذکر کو مختلف فیہ بتاتے ہیں، آخر میں یہ بحث کی گئی ہے کہ میلاد کو مطلقاً بند کر دیا جائے یا باقی رکھا جائے تو کس صورت میں؟ مصنف کا خیال ہے کہ اصلاحات کے ساتھ یہ جاری رکھا جا سکتا ہے، یہ کتاب نصف صدی پہلے لکھی گئی تھی، یہ اس کا دوسرا ایڈیشن ہے، جو لوگ واقعی سنجیدگی سے اس مسئلہ کی نوعیت و حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہوں، ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہے۔

بریلوی فتنہ کا نیا روپ۔ از مولانا محمد عارف سنبھلی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۴۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت بیس روپیے، پتہ: کتب خانہ الفرقان، ۳۱ نیا گاؤں مغربی، لکھنؤ۔

چند ماہ قبل اس کتاب کے پہلے ایڈیشن پر معارف میں مفصل تبصرہ کیا گیا تھا، اب دوسرا ایڈیشن مزید اضافہ کے ساتھ شائع ہوا ہے، ارشد القادری صاحب نے اپنی کتاب "زلزلہ" میں علمائے دیوبند پر یہ الزام عاید کیا تھا کہ وہ جن امور کی بنا پر اولیاء کی جانب نسبت کو کفر و شرک بتاتے ہیں ان ہی امور کو خود اپنے اکابر کی جانب منسوب کرتے ہیں اور اس میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے، "زلزلہ" کے جواب میں متعدد کتابیں لکھی گئیں، یہ کتاب سب میں بہتر اور مدلل ہے جو اس فن کے پرانے ماہر مولانا محمد منظور نعمانی کی نگرانی میں لکھی گئی ہے، کاش مسلمان باہمی اختلافات میں الجھ کر اپنی صلاحیتیں ضائع کرتے۔

"ض"

جلد ۱۲۱ ماہ ذی قعدہ ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۷ء عدد ۵

مضامین